قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اِکہتّرواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اپریل 2014ء

www.toluislam.com

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ O اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ O

(البقرہ:12-11)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ
زمین پر فساد نہ پھیلاؤ
تو جواب میں کہتے ہیں کہ

ہم تو
اصلاح کرنے والے ہیں

یاد رکھو یہی لوگ ہیں جو فساد کر کے معاشرے کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے، حیرت ہے کہ یہ لوگ اس کا بھی احساس نہیں کرتے کہ ان کے قول و فعل کا یہ تضاد ان کی اصل و حقیقت کس طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

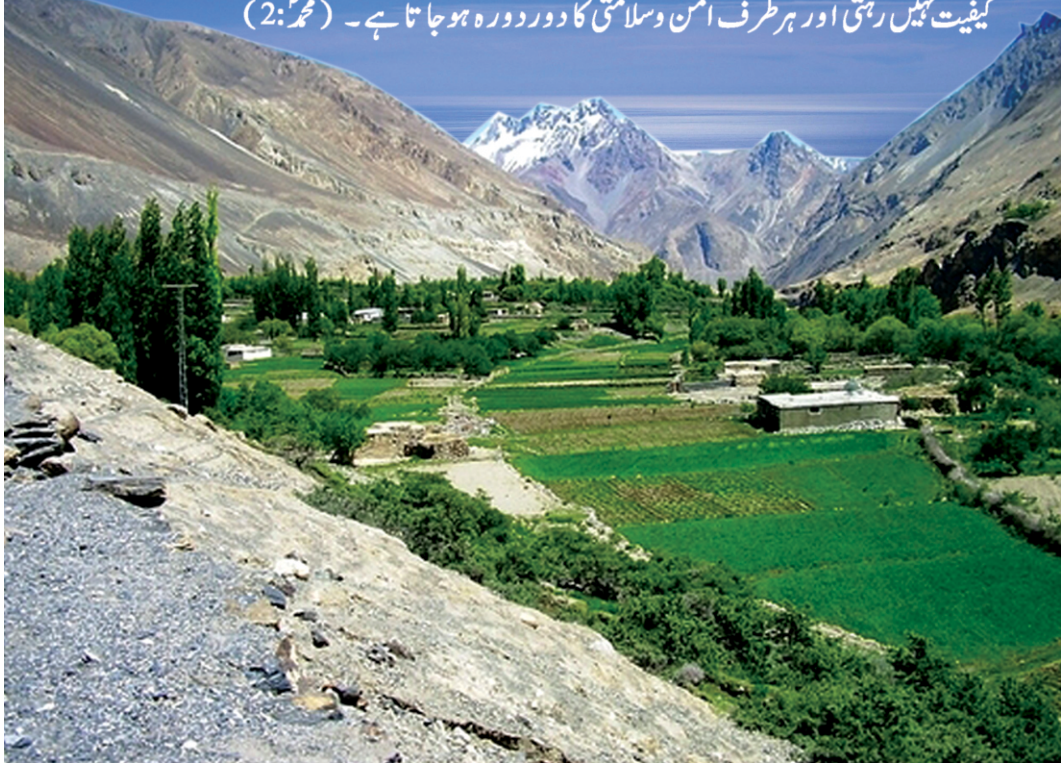
CPL NO. 28
VOL.67
ISSUE
4

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666 , 042-35764484
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے یعنی ایسے کام کرتے رہے جن سے ان کی اور دوسروں کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا رہے، یہی لوگ ہیں جو اس ضابطہ زندگی (قرآن) پر ایمان رکھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا جو ان کے رب کی طرف سے برحق ہے۔ ان کے اس یقین محکم اور عمل پیہم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پا کر ان کی حالت سنوار دے گی۔ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں فسادات کی کیفیت نہیں رہتی اور ہر طرف امن وسلامتی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ (محمدؐ:2)



جلد 67 شمارہ نمبر 4 اپریل 2014ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: دانتے، ابن عربی اور اقبالؒ کا جاوید نامہ	ادارہ	3
اقبالؒ کا مردِ مومن	غلام احمد پرویز	7
مذہبی پیشوائیت	ملک منظور حسین لیل	19
تخلیق کی نور افشانی	راجہ عبدالعزیز	28
دُنیا نیوز پر مجیب الرحمٰن شامی کی گفتگو	ادارہ	40
وراثت کتاب کے تقاضے اور اس کی ذمہ داریاں	خواجہ ازہر عباس	41
ویلنٹائن ڈے، بسنت، نیو ائیر اور دیگر لہو ولعب	عطاء الحق قاسمی	47

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Qiyamah* – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez

Parah 29: Chapter 23 Translated by: Dr. Mansoor Alam 50

دفتر کا پتہ B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان

فون: 042-35714546، 042-35764484

E-mail: idara@toluislam.com

انتظامیہ

ناشر وقائم مقام چیئرمین محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی

محمد سلیم اختر

قانونی مشیر

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِتعاون

پاکستان میں 40 روپے فی پرچہ

سالانہ -/450 روپے

بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر

3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ

برانچ کوڈ (0465) ۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

Naveed Graphic 5.5x8 1c

ادارہ

لمعات

دانتے، ابنِ عربی اور اقبالؒ کا جاوید نامہ

(مئی 1968ء کو پرویز صاحب نے ''جاوید نامہ'' پر اپنے لیکچرز کا آغاز کرتے ہوئے جو تعارفی کلمات ادا کئے تھے وہ مارچ 2014ء کے ''طلوع اسلام'' کے لمعات کے طور پر پیش کئے جا رہے ہیں۔ پرویز صاحب کے متذکرہ بالا لیکچرز اب کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں جو کہ ادارہ سے دستیاب ہیں۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیے ''جاوید نامہ'' کا معلومات افزاء خوبصورت تعارف پرویز صاحب کی زبان سے: ادارہ)

سارے تصوف کی بنیاد یہ ہے کہ کیا علم کا سرچشمہ فکرِ انسانی سے ماورا کوئی اور بھی ہے؟ قرآن کریم نے بتایا کہ وہ سرچشمہ صرف وحی ہے اور وحی خاصۂ نبوت ہے، غیر از نبی کو وحی نہیں ملتی۔ نبیٔ اکرم ﷺ کی ذات پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا لہٰذا اس کے بعد اب ہمارے لیے جو سرچشمۂ علم ہے، وہ تو قرآن کریم کے حقائق ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے انسانی فکر، شعور، مطالعۂ فطرت، مشاہدات، تجربات یعنی وہ ساری چیزیں ہیں جن کا تعلق فکر سے ہے۔ اس سب سے ماورا چلے جائیں تو فکر نہیں رہے گی، REASON نہیں رہے گا، دلیل نہیں رہے گی، برہان نہیں رہے گی، Logic (منطق) نہیں رہے گی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہرحال ان توجیہات کی بنیادوں پر ہی تصوف کی عمارت قائم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ یہ اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے، قرآن کریم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا۔ قرآن عقل وفکر کو ہی دعوت دیتا ہے، وحی پر ایمان لانے کے لئے کہتا ہے، اسے عقل وفکر کی رو سے سمجھنے کے لیے کہتا ہے۔

''جاوید نامہ'' میں بھی اقبالؒ آپ کو کشمکش میں مبتلا نظر آئیں گے۔ جاوید نامہ تحریر کرنے کا جو طریق اقبالؒ نے اپنایا ہے وہ ہمارے ہاں معراج کے متعلق ایک خاص دور میں آیا اور اس کی بڑی روایات پھیلیں۔ کہ نبی اکرم ﷺ آسمانوں پر جاتے ہیں، وہاں جا کر وہ گزرے ہوئے لوگوں سے ملتے ہیں۔ ملنے کے بعد واپس آ کر ان کی کچھ باتیں بیان کرتے ہیں، آخر میں آں سوئے افلاک چلے جاتے ہیں جہاں خود خدا سے ملتے ہیں۔ اور ان روایات کی بنا پر ہمارے ہاں کے صوفیا میں سے اکثر نے اپنے اپنے مشاہدات کی کیفیات بھی بیان کیں۔

ان میں سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ (شیخ اکبر محی الدین) ابن عربی (1240-1165-638ھ560ء) نے ''فتوحاتِ مکیہ'' میں اپنی کیفیات بیان کیں۔ وہ یہاں سے چلا ہے' اپنے ساتھ دو راہبر لیے ہیں' ایک فلسفی اور دوسرا عالمِ دین ہے۔ وہ افلاک پر پہنچتا ہے اور وہاں سے اپنے مشاہدات' نگاہ کے دامن میں لے کر واپس لوٹتا ہے' انہیں اپنی کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' میں بیان کرتا ہے۔ گویا یہ اس کی اپنی واردات ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ میرے ذاتی واردات ومشاہدات (PERSONAL EXPERIENCES) ہیں جن کو وہ یوں بیان کر رہا ہے۔ ابن عربی کا سن وفات 638 ھجری بمطابق 1240 عیسوی ہے۔

اس سے بھی قبل ابوالعلا معری (م۔1058ء) ہمارے ہاں اندھا (عربی زبان کا) شاعر' ادیب اور ایک بہت بڑا عالم گزرا ہے' اس نے بھی ایک ذاتی معراج نامہ لکھا ہے۔ اگرچہ اس کا طریقہ کار ذرا مختلف ہے۔ اُس زمانے کے علما نے شعرا پر بہت سے اعتراضات کیے اور ان کے متعلق کہا کہ یہ سب جہنم میں ہوں گے۔ یہ معری اوپر گیا اور وہاں جنت میں بڑے بڑے شعرا سے ملا' واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ میں تو انہیں جنت میں دیکھ کر آیا ہوں۔ اسی لیے ''رسالۃ الغفران'' معری کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے یعنی مغفرت کا رسالہ کہ ان سب کی مغفرت ہوگئی ہے۔ معری کا یہ رسالہ اس لیے مشہور ہوا کہ عربی ادب میں اس پائے کی کوئی تصنیف نہیں یعنی ایک تو یہ اندھا تھا' اور ہمارے ہاں دوسرا اندھا ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہے جس کا کہنا ہے کہ ادب کے اعتبار سے' ہم اسے قرآن کریم کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ الگ موضوع ہوگا۔ ادب کا مقام ہو یا نہ ہو' قرآن کریم کی مثل جب قرآن کریم کہتا ہے' کہ کوئی انسان نہیں لا سکتا' تو ہمارے لیے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن بہرحال یہ ''رسالۃ الغفران'' جو ابوالعلا معری کا رسالہ ہے' ادبی اعتبار سے اہم ہے۔ ابوالعلا معری' ابن عربی سے پہلے آیا۔ 1058 عیسوی میں اس کی وفات ہوئی ہے۔

یہ روایات چلی آ رہی ہیں۔ اس کے بعد اٹلی کے مشہور شاعر اور افسانہ نویس دانتے نے مقدس طربیہ ڈراما (DIVINE COMEDY) لکھی۔ اُس نے پہلے اس کا نام صرف کامیڈی رکھا تھا' بعد میں اس کے عقیدت مندوں نے اسے DIVINE COMEDY (مقدس طربیہ ڈراما) کا نام دے دیا۔ یوں سمجھئے کہ یہ ابن عربی سے تقریباً سو سال بعد کا دَور ہے' 1321 عیسوی کے قریب دانتے کی وفات ہوئی تھی۔ یہ اپنے مشاہدات بیان نہیں کرتا بلکہ ادبی انداز میں ڈرامہ تحریر کرتا ہے' جس کی اساس ایک لڑکی بیٹرس (BEATRICE) پہ رکھی جس سے اسے محبت ہوجاتی ہے مگر وہ لڑکی مرجاتی ہے' جس کی تلاش میں وہ اپنے شاعر دوست ورجل (VIRGIL) کی رہنمائی میں مختلف افلاک سے گزرتا ہوا جنت میں جاتا ہے۔ ورجل (C.70-19 BC) کے علاوہ یونانی فلسفی اور مختلف مقامات سے مزید تین چار ساتھی اس کے ہمرکاب ہوجاتے ہیں۔ بالآخر وہ جنت میں پہنچتا ہے تو وہاں صرف بیٹرس ہوتی ہے۔ اس کا مقدس طربیہ ڈرامہ اُن تمام روایات کا چربہ ہے جو ہمارے ہاں پہلے سے رائج ہیں' پلاٹ بہرحال وہی ہے' تقریباً چربہ بھی وہی ہے لیکن وہ صوفیا کی طرح اپنی واردات بیان نہیں کرتا بلکہ ایک ادیب کی طرح' ڈرامے کا پلاٹ لکھتا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ادب

میں اس کا بھی اپنا مقام ہے' اگرچہ مسلمانوں کے متعلق اس کی خباثت دیگر پادریوں سے کم نہیں ہے۔ وہ ڈرامے میں نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو جن مقام پر دکھاتا ہے' وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ان کو دیکھ سکیں' برداشت کر سکیں یا بیان بھی کر سکیں۔ بہرحال یہ اس کا اپنا کام تھا جو اس نے کیا۔

(مولانا جلال الدین) رومیؒ (1207-1273AD) نے اگرچہ اس قسم کا کوئی معراج نامہ نہیں لکھا لیکن وہ اپنی واردات EXPERIENCES کو حکایات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ یہ بھی تقریباً ابن العربی ہی کا چربہ ہے۔ یہ یاد رکھیے! میں ابن العربی کہہ کر فوراً مڑ گیا ہوں۔ یہ ابن العربی اور ہے۔ یہ ابن عربی (شیخ اکبر محی الدینؒ: 1165-1240AD) ''فتوحاتِ مکیہ'' والا ہے' اور وہ جو ابن العربی ہے' اس کی ایک کتاب ''احکام القرآن'' ہے۔ محی الدینؒ ابن عربی کو شیخ اکبر کہتے ہیں' ان کی ''فتوحاتِ مکیہ'' ہے۔ وحدت الوجود اس شخص نے ایک فلسفے کی حیثیت سے پیش کی اور جس طرح افلاطون (B.C 347-428) کی کیفیت تھی کہ اس کا دماغ بہت بڑا اور گردن ٹیڑھی تھی' وہ دنیا کو غلط راستے پہ ڈال گیا اور اڑھائی ہزار سال سے دنیا کی کوئی قوم اس کے اثر سے نہیں بچی اور آج تک اس اثر سے باہر نہیں نکل سکی۔

افلاطون کے بعد اسی قسم کا دوسرا GENIUS (نابغہ) جو میں دیکھتا ہوں' وہ ابن عربی ہے۔ وہ بہت بڑا ادیب اور عالم ہے' اس کی گردن بھی ٹیڑھی ہے۔ اس نے وحدتِ وجود جیسی شے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ وجود کا سارا تصور افلاطون (PLATO) سے لیا ہوا ہے لیکن افلاطون کے دلائل ایک مسلمان کو اپیل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ان کو اسلامی دلائل کے رنگ میں وحدتِ وجود کے ساتھ اس طرح ثابت کیا کہ اس سے اسلام کو بالکل جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔

اس سارے قصے کی ابتدا یوں ہوئی جس طرح دانتے (DANTE) بیٹرس (BEATRICE) پر عاشق ہوئے اور آسمان پہ پہنچے' یہ محی الدین ابن عربیؒ بھی حج کرنے مکے گئے اور وہاں ایک بدولڑکی پہ عاشق ہو گئے۔ اور وہیں بیٹھ گئے' چنانچہ اس کو سامنے رکھنے کے بعد یہ ساری ''فتوحاتِ مکیہ'' لکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ دانتے (DANTE) نے بیٹرس (BEATRICE) کو مجازی محبوب کہا' ابن عربی نے اس کو محبوبِ حقیقی قرار دے لیا۔ اب یہ مجاز اور حقیقت کا فرق کرتے جا رہے ہیں۔ وہ ایک دیانت دارانہ بات کر رہا ہے اور یہ سب کچھ لے کر آ گیا لیکن ابن عربی کا منطق (LOGIC) چونکہ بڑا مدلل ہے جو بڑے بڑوں کو بہا لے جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ آپ دیکھ لیجئے کہ اس کو بھی گویا کوئی ہزار برس ہو گئے' وہ مسلمانوں کے سارے ادب کو متاثر کر گیا ہے۔ ہر سمت تصوف بکھر گیا۔

اس کے بعد جب یہ شاعری ایران میں آئی تو اہلِ ایران کو تو ایسی چیز خدا دیتا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اسلام کو کسی طرح اس کے اصل سے ہٹا دیا جائے۔ ایران کی ساری شاعری وحدتِ وجود کی شاعری ہے۔ وہی شاعری آپ کے ہاں آ پہنچی۔ یہاں بھی تمام شاعری کا محور وحدتِ وجود ہی ہے۔ محبوب و معشوق کے متعلق جو جی میں آئے کہتے جایئے' آپ آرام سے کہہ دیجئے کہ سب کچھ محبوبِ

حقیقی کے متعلق کہا ہے جبکہ یہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے' یہ سب کا سب جائز ہی نہیں ہے۔ یہ تو مذہب ہے جو آج ہمارے ہاں دین میں سند ہو گیا ہے۔

اقبالؒ نے غالباً یہ تصور دانتے سے نہیں بلکہ ابن عربیؒ سے مستعار لیا ہوگا کیونکہ ابن عربیؒ پر اس کی نظر تھی۔ اس خیال اور اس طریقہ کار کے تابع انہوں نے ایک معراج نامہ لکھنا چاہا اور اس کا نام معراج نامہ نہیں رکھا کیونکہ اقبالؒ کو ذاتِ رسالت ﷺ سے اتنا عشق تھا کہ ان کی غالباً یہ خواہش رہی کہ اپنے تصورات کو معراج سے تعبیر کریں۔ اس لیے انہوںؒ نے اس کا نام ''جاوید نامہ'' رکھا ہے لیکن طریقہ کار اس کا بھی وہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اقبالؒ اسے اپنی اندرونی واردات (INNER EXPERIENCES) کہہ کر نہیں بیان کرتا بلکہ وہ اپنی علمی کیفیات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اقبالؒ اسے اپنے علم کی اُن بلندیوں پر لے گیا ہے کہ میرے نزدیک اگر علمی اعتبار سے یہ پرکھنا ہو کہ اقبالؒ کتنا اونچا تھا' تو ''جاوید نامہ'' دیکھنا چاہئے۔ اس کے علم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ''بدھ اور بروٹ'' فلاسفر کے زمانے سے ابتدا کرتا ہوا آج تک کی دنیا کے ہر خطے میں گزرنے والے ہر مذہب سے وابستہ بڑے لوگوں کے نقطۂ نظر سے بحث کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ ہر مکتبہ فکر کے نظریات' ان کا فلسفہ' عقیدہ' مذہب کی تفصیل' کچھ اس وضاحت سے پیش کرتا ہے کہ انسان سینکڑوں کتابوں سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

رسالہ طلوع اسلام کے محترم خریدار توجہ فرمائیں

ہر ماہ جب آپ کو مجلّہ طلوع اسلام بذریعہ ڈاک موصول ہو تو براہِ کرم لفافہ کھولنے سے پہلے لفافہ پر لکھے اپنے ایڈریس سے ذرا اُوپر ایک نگاہ ڈال لیا کیجئے۔ اِس سے آپ کو اپنے خریداری نمبر کے ساتھ آپ کے میگزین کی سالانہ زرشرکت کی ادائیگی کی ایک جھلک نظر آ جائے گی۔ اگر آپ کی سالانہ زرشرکت ختم ہو چکی ہو تو از روئے مہربانی مطلوبہ رقم بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ادارہ کے نام ارسال فرما دیجئے۔

ادارہ طلوع اسلام لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے بندۂ مومن! تو کجائی! تو کجائی!

اقبالؒ کا مردِ مومن

علامہ اقبالؒ کے یوم وفات کی تقریب

پرویز صاحب کا خطاب (اپریل 1974ء)

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہل پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے۔ پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتاب جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش ونگارِ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ''کہ از یٰسین اور آساں بمیری''۔ پھر سے کتابِ زندہ کی صورت میں پیش کیا۔ اور اہل پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشت پیمائی اور صحرا نوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا۔ یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں 1938ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کرائے چلا آ رہا ہوں اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے۔ ''پیغام اقبالؒ اور قرآنِ کریم'' میرا مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام وکمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جا سکتا ہے۔ میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے ''اقبالؒ کا مردِ مومن''۔ اس موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے..... ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہموار اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ ''تمہید'' کے بنیادی معنی یہی ہیں۔ اور اقبالؒ تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزرعِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمینِ خاکِ درمیخانۂ ما فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید یا دیباچہ یہ ہے۔

تمہید

قرآنِ کریم' داستانِ حیات کو بڑے عجوبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی' ناقابل نمو' جامد مادہ (INORGANIC MATTER) میں محوِخواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔ یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اوّلین جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔ یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا جس سے نر و مادہ کا امتیاز عمل میں آ گیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات' شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا' پھولتا' پھلتا' رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ تآنکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہو گیا اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کر لیا[1]۔

یورپ کے سائنس دان اپنی صدیوں کی تحقیق و کاوش کے بعد اُس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ان اشارات میں بیان کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اور قرآنی حقائق میں ایسا ناقابل مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اور ایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔ مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔ دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے کھاتے پیتے' افزائش نسل کرتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر' انسانی پیکر' ارتقاء کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصورِ حیات کو کفر' یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ** [47:12] حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتداء اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی' پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا۔ اس نے جس طرح انواع واقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے۔ اپنی خاصیتیں بدلتیں' نوعیتیں تبدیل کیں۔ اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ و رعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑی مسکرا رہی ہے' وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومہ حیات سے ہوا تھا۔ ذرا سوچو کہ یہ تمام محیر العقول پروگرام۔ یہ حیرت بدوش زندگی۔ یہ سرتاسر طلسماتی منزلیں۔ اس تمام نظامِ ارتقاء کا ماحصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکر اس کارگہِ نمود و وجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کر کے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور یہ نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے! العبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را۔ قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں۔ یہ ایک جدید سلسلہ ارتقاء کی اوّلین کڑی ہے۔ یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی

---

1 میں نے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملے گی۔

سے عبارت نہیں۔اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات' نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشوونما تھا لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشوونما ہے۔انسانی جسم کی نشوونما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رُو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان غیر متبدل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔انسانی جسم کی نشوونما کیسے ہی لطیف ونفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے۔ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا۔لیکن جب انسانی ذات کی نشوونما سے' انسان' سلسلۂ ارتقاء کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے' پھر موت سے اس کا جسم تو پیوندِ خاک ہو کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔جس انسان میں اس کی ذات کی نشوونما شروع ہو جائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔دین (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومن بنانا ہے۔قرآنِ کریم وہ ضابطہ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رُو سے ایک انسان' مردِ مومن بن سکتا ہے۔اس پروگرام کی رُو سے' حسنات وہ اعمال ہیں جن سے انسانی ذات کی نشوونما اور تعمیر ہوتی ہے اور سیئات وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔یہی خیر وشر کا نقطۂ امتیاز اور نیکی اور بدی کا معیار ومقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (THEORETICAL) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ.....معاشرتی' معاشی' سیاسی' تمدنی وغیرہ' اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفر اور ایمان کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔مغربی نظریہ کی رُو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماوراء یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ ''جنگل کا قانون'' کارفرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریانہ زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔اسی کو سیکولرازم یا لادینیت کہا جاتا ہے اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے وہ اسی نظریہ کے برگ وبار ہیں۔اقبالؒ کے الفاظ میں

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیر گردوں رسم لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب وگل است کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد۔صہ 56)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیروزبر کر دیتا ہے۔یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کی رُو سے دین اور دنیا میں کوئی مغائرت یا ثنویت نہیں تو اس سے یہی مراد ہے۔جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوامِ مغرب کا زاویہ نگاہ نہیں بدلتا' وہاں کے سیاسی' معاشی' معاسرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔اس غلط نظریہ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آ رہے ہیں کہ انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔اس سے

آگے کچھ اور ہے اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کے انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روس کا مشہور مفکر اؤس پینکی اپنی مشہور کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں لکھتا ہے:۔

اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پاسکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی صرف اس نہج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلاسکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جاسکتا۔

برگساں اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ ''انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوعِ انسان پر عاید کر رکھی ہیں''۔

(TWO SOURCES OF MORAILTY AND RELIGION)

اور پروفیسر آرتھر تھامسن اپنی کتاب (GOSPEL OF EVOLUTION) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ:۔

ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ ہکسلے نے یہ غلط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی مقاصد سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس، ہم پروفیسر ,(FATRICK GEEDS) سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت، ارتقائی کتابِ مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جارہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریۂ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاء کی طرف آرہے ہیں لیکن چونکہ قرآن کی شمعِ تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام، ہنوز نکھر اور اُبھر کر ان کے سامنے نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہوجائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔

مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ ان اقدار کی اصل وحقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رُو سے کرایا ہے۔ جنہیں الاسماء الحسنٰی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان صفات یا اسماء کی رُو سے ذاتِ خداوندی کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔ انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں۔ مثلاً ھوالاول و الاخر۔ ھوالظاھر والباطن۔ یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہونا۔ یافاطر السمٰوٰت والارض ۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ اس قسم کی صفات کے سوا، باقی ایسی ہیں جنہیں انسان علیٰ حد بشیریت، اپنی ذات میں منعکس کرسکتا ہے۔ انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انہیں صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138) یا اللہ کا رنگ کہہ کر پکارا ہے۔ جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے، اس کی ذات

کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پر نگاہ ڈالئے' یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفو کریم بھی ہے اور جبار و متکبر بھی۔ ان صفات میں باہمد گر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقعہ پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہات سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتا ہے اور ان سے سرکشی برتنے والے کی نخوت و تکبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں' اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآنِ کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گنادی جاتی ہیں (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے' بددیانتی نہیں کرتے وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومن' دوسرے ''نیک لوگوں'' سے منفرد ہوتے ہیں وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آئے تو اس وقت جس صفت خداوندی کو ظہور میں آنا ہو' مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو یعنی ہر واقعہ پر اس کا ردِّعمل وہی ہو جو اس کے خدا کا ''ردِّعمل'' ہو۔ گرفت کے موقعہ پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے نوکِ نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھاہا۔

اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آ گئی ہوگی کہ قرآنِ کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر در حقیقت مومن کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومن بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے ''نمود'' کا لفظ ارادۃً استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً) جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (WITH EFFORT) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے۔ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحیمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہئے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموئی سموئی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی' لطافت' نزاکت اور طبی خواص۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے قرآنِ مجید در حقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرۂ جمیلہ ہے اس کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [21:10] ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔

دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبالؒ کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآنِ کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیاتِ کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے اسی طرح اقبالؒ بھی گوناگوں انداز سے مومنؔ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نظام سے مقصد افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہی ہے یا یہ نظامِ کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ حقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (5:56) کہہ کر پکارتا ہے یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعت مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی لیکن مکہ میں ابھی ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہِ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ

(اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمینِ مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم، مرد، عورتیں، بچے کس طرح بلک بلک کر ہمیں پکار رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بحفاظت نکال لینے کا سامان پیدا کر دے۔ تو ہمارے لئے کوئی مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت پناہ بنا۔ (4:75)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکار رہے تھے اور خدا ''حزب اللہ'' یعنی اپنی پارٹی سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے! یہ ان کی مدد کے لئے اٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدانِ جنگ میں فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ [8:17] وہاں ان مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى [8:17] تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ اس لئے تھا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا [9:40] کہ مخالفین حق و صداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے اور اس کے لئے کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ [47:7] اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا کہ درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعت مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش وبصیرت افروز انداز جس سے خدا ان کا تذکرہ کررہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام قرآن کے پیغام ہی کی تشریح وتبیین ہے اس لئے ان کا کلام بنیادی طور پر مردِ مومن کی خصوصیات، مقام، فریضۂ حیات اور مطمحِ زندگی کا تابندہ ودرخشندہ آئینہ ہے۔ آیئے اس آئینہ میں مردِ مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں، صفاتِ خداوندی علیٰ حد بشریت جھلمل جھلمل کررہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھئے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم مسجد قرطبہ میں کس وجد آفریں انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب وکار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو! — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم وطلسم ومجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں، گرمی محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں ''عقل کی منزل'' اور ''عشق کا حاصل'' کی اصطلاحات پر غور فرمایئے اور پھر قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [3:190-191]

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل وبصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں اُن صاحبانِ علم وبصیرت کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہٰذا، مردِ مومن، علم ویقان، فکر وایمان، عقل وعشق، خبر ونظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات

کا مجموعہ ہوتی ہے جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور یوں دنیا اس طلسم کدۂ رنگا رنگ (KALEIDOSOCOPE) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی اور وجد و کیف کے عالم میں بیساختہ پکار اٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

اللہ کی برہان

ان ابیات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان۔ تو اس سے مراد کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہرِ تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ مونالیزا کے سحر آفریں تبسم کا خدنگِ بے کمان، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے احسن تقویم میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی حسین ترین ہیئتِ ترکیبی لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہیئتِ ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [95:5-6] انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں۔ لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں چاہے ڈھال لے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بے باک جذبات کی رَو میں بہہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین رکھتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ انہی کو مومن کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مومن کی ہر نقل و حرکت خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے۔ اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے مومن..... گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔

تقدیر یزداں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے۔ یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیت، اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔ اس موقعہ پر جو فیصلہ مردِ مومن کا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیت ہے۔ خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ [76:30] وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ ان کی مشیت، مشیتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔ اس حقیقت کو حضرت

علامہ نے اپنے شعر میں باندازِ نو بیان کیا ہے جسے دہرایا تو اکثر جاتا ہے لیکن سمجھا بہت کم۔ یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات' صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے' خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ماپنے کا مقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے میدان میں جماعت مومنین کی مقاتلانہ تگ وتاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے' ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں:۔

عزمِ اُو خلاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا؟ تیر اُو تیرِ حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر' مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

تقدیر کے ہاتھوں رونے والے مسلمان کو وہ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جب مومن اس طرح خود ''تقدیرِ یزداں'' بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگِ کائنات تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے۔ مردِ مومن' جب اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کر دیتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہ کے یہ کہنے کا کہ..... قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے..... یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنا دیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمال نامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس پیمانے پر پورے اُترے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ

دنیا میں بھی میزان' قیامت میں بھی میزان

عقل و جذبات

اب آگے بڑھئے۔ عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آ جاتے ہیں تو انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ نا قابلِ قبول سی نظر آئے گی' لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود شدتِ جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابل نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کر دینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے عقل کا فیصلہ قرار نہیں پا سکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آ ہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے' عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہٰذا' عقل کا کب یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے کارآمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود عضو معطل بن کر رہ جائے۔ ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو' ترکِ مقاصد اور یہ خالص جذباتی چیز ہے اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابل غور ہے۔ انسانی جذبات بھی اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہٰذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شر' قابل نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور آخری بات یہ کہ جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کر سکیں۔ اُنہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں' فنا نہیں کر سکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تراش لیتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بدنہادی یا (PERVERSION) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جذبات کو قابل نفرت فلہٰذا' فنا کر دینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بے باک نہیں ہونے دینا چاہئے۔ انہیں ہمیشہ..... ہدایت..... یعنی اقدارِ خداوندی..... کے تابع رکھنا چاہئے۔ جب جذبات آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو ان کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہو گا۔ لیکن جب یہ اس سے سرکشی اختیار کر جائیں گے تو اس سے تباہی و بربادی' تخریب اور فساد پیدا ہو گا۔ اس کا ارشاد ہے کہ **وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ**

[28:50] ''اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہوسکتا ہے جو ہدایت خداوندی سے بے نیاز ہوکر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے''۔ مومن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لایئے جو ضربِ کلیم میں مدنیتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اسکی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں!

اس سرتاپا مرصع نظم کا ایک ایک شعر قرآن کی روشنی میں توضیح وتشریح کا متقاضی ہے۔ لیکن نقطہ زیرِ نظر کی رعایت سے ہم سرِدست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی زندگی..... یہ ہے نہایتِ اندیشہ وکمالِ جنون..... یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو اور جذبات کی ایسی شدت جو سطحِ بیں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآنِ کریم نے عقل وجذبات کے اسی امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** [3:159] اے رسولؐ! تم مہماتِ امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کرلو تو پھر قوانین خداوندی کی محکمیت پر یقین کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ۔ اور تمام خطرات سے بیگانہ ہوکر جانب منزل بڑھتے چلے جاؤ..... یقیناً فتح ونصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ مشورہ، نہایتِ اندیشہ، کمالِ عقل وفکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہوجائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا، وحی خداوندی کی روشنی میں عقل وبصیرت کی رُو سے، پیشِ نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزمِ راسخ ہے اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقینِ کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ **الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ** [3:173] وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکر جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے ان سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے بجائے اس کے کہ وہ خائف ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پروا کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم وتوکل جس کی رُو سے وہ دیوانہ وار، آتشِ نمرود میں کود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آجاتے ہیں۔ دیکھئے اقبالؒ اس حقیقت کو کیسے بصیرت

افروز انداز میں بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اُمتاں را زندگی جذبِ دروں کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد بے جنونِ ذوفنون کارے نکرد!

مومن از عزم و توکل قاہر است
گرندارد ایں دو جوہر کافراست

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدارِ خداوندی کے تابع رہتے ہیں۔ اسے قرآنِ کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ [9:24] اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنت شاقہ سے حاصل کیا ہے وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو۔ وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اور تمہارے یہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ تمہارے نزدیک، خدا، رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ [9:24] تا آنکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کر دے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ..... یہ ہے قرآن کی رُو سے، اقدارِ خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت۔ اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر، اقدارِ خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے، ہدایت خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبر کی رُو سے کرتا ہے۔ اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بروئے کار لانے کا عزم کر لیتا ہے تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جب کہا ہے کہ

فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بہ کردارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آئیں تو وہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

مذہبی پیشوائیت
احبار و رُہبان

(گزشتہ سے پیوستہ)

فرسودہ روایات کی محافظ:۔ طلوعِ اسلام فروری ۱۹۷۲ء ص۔۳۰۔ ''آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت، اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت، ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے۔ اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ:۔

حکایتِ قدِ آں یار، دلنواز کنم　　بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرم ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی، اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔'' (یعنی تبلیغِ دین کسی ایک گروہ کا کام نہیں تھا، بلکہ یہ فریضہ اسلامی مملکت سرانجام دیتی تھی)۔

فریضہء امر بالمعروف و نہی عن المنکر:۔ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء ص۔۹ تا ۲۱): موءلف کے خط کے جواب میں پرویز صاحب نے وضاحت فرمائی کہ:۔ ''خط میں بنیادی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ:۔ ''اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے لیکن پرویز صاحب اس حکمِ قرآنی کی تعمیل میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں

لائے''۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ اس قسم کی جماعت کا قیام مناسب یا مفید رہے گا بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور چونکہ میں نے اس حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کی اس لئے میں معصیتِ خداوندی کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا نے امت کے اندر مذہبی فرقے یا جماعتیں بنانے کا حکم تو چھوڑ، اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ اس نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے اور اسے شرک قرار دیا ہے۔ میں اس موضوع پر کافی کچھ لکھ چکا ہوں لیکن چونکہ مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے اس گمراہ کن نظریئے کی بڑی شدومد سے اشاعت کی جا رہی ہے (اور اسی وجہ سے مراسلہ نگار بھی اس سے متاثر ہیں) اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اس باب میں قرآنی احکام اور تعلیم کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے۔ ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کی گمراہ کن مغالطہ آفرینی سورہ ءآلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ کی تاویل کی آڑ میں کی جاتی ہے۔ اس آیت کو تو ہم بعد میں پیش کریں گے، پہلے یہ دیکھئے کہ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' (نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کے فریضہ کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد کیا ہے؟۔

(۱):۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو حضور ﷺ کا ایک اہم فریضہ یہ قرار دیا کہ:۔ یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر (۷/۱۵۷)۔ ''وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا''۔ ہم اس مقام پر معروف اور منکر کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن امور کو قرآن کریم جائز اور درست قرار دیتا ہے، وہ معروف ہیں اور جنہیں وہ غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے، وہ منکر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔

(۲):۔ لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہ فریضہ تنہا رسول اللہ ﷺ کا نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک امت کی تشکیل بھی ہوئی تھی اور اس امت کا بھی یہی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورہ ءآلِ عمران میں ہے:۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (3:110)۔ ''تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔'' اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری امت کا تھا، نہ کہ امت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں امت یہ فریضہ حضور ﷺ کی سرکردگی میں سرانجام دیتی تھی۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اسے یہ فریضہ تنہا سرانجام دینا تھا۔

(۳):۔ قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ فریضہ پوری کی پوری جماعتِ مومنین کا ہے، کسی خاص گروہ کا نہیں۔ سورہ ءتوبہ میں مومنین کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں:۔ **الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (9:112) کہا گیا ہے یعنی ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے''۔

(۴):۔ دوسرے مقام پر مومنین کے ساتھ مومنات کا بھی اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ فریضہ امت کے مرد اور عورتیں سب کے سب سرانجام دیں گے۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔ **وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ**

عَنِ الْمُنْكَرِ (9:71)۔ ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔''

ان تمام آیات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ امر کے معنی کسی بات کا حکم دینا ہیں اور نہی کے معنی کسی کام سے حکماً روک دینا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ اسی صورت میں انجام دیا جا سکتا ہے جب یہ امت صاحبِ اقتدار ہو، چنانچہ سورہ الحج میں ہے کہ:۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (22:41)۔ ''یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلواۃ، ایتائے زکواۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔'' اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں اقتدار پوری کی پوری امت کو حاصل ہوتا ہے، کسی خاص گروہ کو نہیں (دیکھئے ۔۵۵/۲۵)، لہٰذا، اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر وعظ ونصیحت کی بات نہیں، اس فریضہ کو اسلامی مملکت احکام وقوانین کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔''

دینی اور سیکولر اسٹیٹ:۔ طلوعِ اسلام اگست ۱۹۷۰ء (صفحہ نمبر ۵۲)۔ ''سیکولر اسٹیٹ میں ''دین اور دنیا'' دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ دنیاوی معاملات کے فیصلے مملکت کی طرف سے ہوتے ہیں اور مذہبی امور کے فیصلے مذہب کے علماء کی طرف سے۔ مسلمانوں میں، جب، صدرِ اول کے بعد، ملوکیت آ گئی تو دین اور سیاست کی یہی ثنویت ان کا بھی معمول بن گئی۔ یعنی ان کے ہاں، مملکت اسلامی ہونے کی بجائے سیکولر ہوگئی۔ جس میں خود قانون دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) پر مشتمل اور دوسرا حصہ، پبلک لاز، تمدنی امور سے متعلق۔ پرسنل لاز میں دائرہ ءاقتدار، علماء کا تسلیم کر لیا گیا۔ اور پبلک لاز، مملکت کے حیطہ ءاقتدار میں رہے۔ یہی اندازِ مملکت وسیاست مسلمانوں کے ہاں آج تک چلا آ رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ انداز ہی سرے سے غیر اسلامی ہے۔ نہ قرآن کریم میں کہیں زندگی کو دین اور دنیا کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور نہ ہی عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ میں اس قسم کی تقسیم وتفریق کا کوئی نشان تک دکھائی دیتا ہے۔ اس میں آپ نے کہیں یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دنیاوی امور کے فیصلے تو مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے ہوں اور دینی معاملات کے لئے علماء کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔ اس دور میں علماء کا کوئی الگ وجود ہی نہیں تھا۔ اس

وقت تو نماز کی امامت بھی عمّالِ حکومت کی ذمہ داری تھی۔ اور جمعہ کا خطبہ امیر المومنین یا گورنر دیا کرتے تھے۔ اس وقت ''حکومت کے فیصلے'' اور ''علماء کے فتاویٰ'' کی الگ الگ اصطلاحات بھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں تعبدی (یعنی وہ معاملات جن کا تعلق ''عبادت'' سے ہو) اور غیر تعبدی امور کی تفریق بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس وقت ''عبادت'' سے مراد تھی احکام وقوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ خواہ ان کا تعلق صوم وصلواۃ سے ہو اور خواہ کاروباری معاملات سے۔ اور ان تمام احکام وقوانین کا نفاذ حکومت کی

طرف سے ہوتا تھا۔ اور وہی اختلافی معاملات میں فیصلے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں نہ اعتقادی اور فقہی اختلافات پیدا ہوئے تھے اور نہ ہی مذہبی فرقوں کا وجود تھا۔ (فرقہ بندی کو تو قرآن نے شرک قرار دیا ہے، اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں فرقے پیدا کیسے ہو سکتے تھے؟)۔ جب احکام وقوانین کے نفاذ کا مرکز ایک ہو اور ان احکام وقوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہو، تو پھر باہمی اختلافات کا کیا سوال اور مذہبی فرقوں کا کیا تصور؟۔ اسلام دین تھا، اور دین میں نہ کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے، نہ کوئی گروہ بندی وجود میں آسکتی ہے۔۔۔ یہ تھا نقشہ اسلامی مملکت کا۔ اس کے بعد (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) جب، اسلامی مملکت کی جگہ، مسلمانوں کی سیکولر اسٹیٹ نے لے لی، تو مذہب اور سیاست دو الگ الگ اور نا قابلِ اتصال، شعبوں میں بٹ گئے۔ اس وقت مذہبی پیشواؤں کا گروہ بھی پیدا ہو گیا اور مذہبی امور کے فیصلوں کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت بھی لاحق ہو گئی۔ چونکہ پاکستان میں بھی حکومت سیکولر چلی آرہی ہے اس لئے اس میں دنیاوی اور مذہبی امور کی ثنویت اور تفریق بھی موجود ہے، اور علماء کا الگ گروہ بھی۔ یہاں تک تو صورتِ حال قابلِ فہم ہے لیکن ہماری غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ اسلامی مملکت میں بھی یہی کیفیت ہو گی۔ یہ تصور غلط ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور اسلامی مملکت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں زندگی ایک نا قابلِ تقسیم وحدت قرار پاتی ہے جس میں دنیاوی معاملات اور دینی معاملات الگ الگ نہیں ہوتے۔ اس میں دنیا کا ہر معاملہ جو احکامِ خداوندی کے مطابق طے پائے، دینی قرار پاتا ہے۔ اس لئے اس میں، زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق فیصلہ کُن اتھارٹی حکومت ہی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کی مشینری اُنہی اربابِ علم وبصیرت اور اعیانِ فکر ونظر پر مشتمل ہو گی جو دنیاوی امور پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ خدا کی عطا کردہ راہنمائی میں ان کے فیصلے کس طرح کئے جائیں گے۔

نظامِ تعلیم کی ثنویت:۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ، صحیح نظامِ تعلیم پیدا کر سکے گا۔ اس وقت ہمارا نظامِ تعلیم بھی سیکولر ہے۔ اس میں دنیاوی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور ''دینی'' تعلیم مکتبوں اور دار العلوموں میں۔ اس وقت سکالر اور ہوتے ہیں، اور علماء اور۔ قانون دان (وکلاء) اور ہوتے ہیں اور ''مفتیانِ شرعِ مبین'' اور۔ عدالت کا فیصلہ اور ہوتا ہے اور فتویٰ اور۔ اسلامی نظامِ مملکت ومعاشرت میں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں ہو گی۔ اس میں ایک ہی درسگاہ ہو گی جس میں دنیاوی علوم اور دینی تصورات کو بیک وقت سامنے لایا جائے گا۔ جس میں بتایا جائے گا کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کا حل، قرآن کریم کی روشنی میں کیا ہو گا؟۔ عام درسگاہوں کے بعد، خاص درسگاہوں میں قانون کی تعلیم دی جائے گی۔ اس میں بتایا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں، ہمارے فقہاء نے قانون سازی کے سلسلہ میں کیا کیا کوششیں کیں اور ہم، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے قوانین وضوابط کس طرح مرتب کر سکتے ہیں؟۔ اس قسم کے قانون دان (فارغ التحصیل طلباء) آگے چل کر، قوانین ساز بھی ہوں گے اور حکومت کے مشیر بھی، ریسرچ اسکالرز بھی ہوں گے اور عدلیہ کے سربراہ بھی۔ اس وقت نہ علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کا الگ وجود ہو گا، نہ ان کے فتووں کی کوئی ضرورت۔ اس وقت ہر معاملہ کا فیصلہ حکومت کی طرف سے ہو گا اور

مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ العمل۔ اس وقت نہ الگ ائمہء مساجد ہوں گے نہ جداگانہ خطیب۔ نہ انفرادی واعظ ہوں گے نہ پیشہ ور مبلّغ۔ یہ سب کچھ اسلامی معاشرہ کی طرف سے ہوگا۔ جس کا دوسرا نام اسلامی مملکت یا حکومتِ خداوندی ہے۔ اس حکومت کے فیصلوں (قوانینِ مملکت) کی پابندی لازمی ہوگی۔ اوران کی خلاف ورزی جرم، جومستوجبِ سزا ہوگا۔ اس وقت نہ کوئی کسی پر کفر کا فتویٰ لگا سکے گا، نہ کسی کو اپنے طور پر اپنے مسلمان ہونے کی سند پیش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت، اسلامی حکومت یہ طے کرے گی کہ ''مسلم'' کسے تسلیم کیا جائے گا اور ''غیر مسلم'' کسے؟۔ اس لئے کہ ان دونوں میں امتیاز، اکثر امورِ مملکت کے سلسلہ میں ضروری ہوگا۔ یہ تھا نقشہ عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی مملکتوں کا، اور یہی نقشہ ہوگا اس اسلامی مملکت کا جو، جب اور جہاں بھی قائم ہوگی۔''

متوازی حکومت:۔ جبکہ تھیاکریسی (تھوڑا سا آگے چل کر وضاحت کی گئی ہے) ''اپنے نتائج کے اعتبار سے سیکولر حکومت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اس میں، مذہبی پیشوائیت، ہیئتِ حاکمیہ کی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے۔ اور ہر معاملہ میں اقتدارِ اعلیٰ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ علماء کو ''انبیاء بنی اسرائیل'' کا درجہ دیتے اور منبرِ رسول اللہ ﷺ کا وارث ٹھہراتے ہیں۔ اپنی ہستی کو لاینفک قرار دینے کے لئے وہ اس قسم کے دلائل دیتے رہتے ہیں کہ:۔ ''بات سیدھی ہے۔ آپ بیمار ہوتے ہیں تو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ آپ کو مکان بنانا ہوتا ہے تو معمار کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ مشینری کا معاملہ ہوتا ہے تو مکینیکل انجنیئر بلاتے ہیں۔ ہوائی جہاز چلانا ہوتا ہے تو پائلٹ کا انتظام کرتے ہیں۔ حجامت کروانی ہوتی ہے تو بار برشاپ سے استفادہ کرتے ہیں۔ سبزی گوشت خریدنا ہوتا ہے تو مارکیٹ جاتے ہیں۔ اب اگر اسلام کے بارے میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ کس طرف دیکھیں گے؟۔ کس کی رائے آپ حاصل کریں گے؟۔ انہیں لوگوں سے جو اسلام جانتے ہوں یا کسی اور سے؟۔'' (بحوالہ۔ دینی مسائل۔ از پیر علی محمد راشدی۔ روز نامہ جنگ کراچی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۷۰ء)۔ ''یہ (سطحی سی) دلیل اس قدر نگاہ فریب اور مغالطہ آفریں ہے کہ اچھے اچھے ذہن بھی اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہاں صاحب! دینی معاملات کا فیصلہ علماء کرام ہی کو کرنا ہوگا۔

ماہرین کی حیثیت:۔ ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ سیکولر حکومت میں تو یہ تقسیم موجود ہوتی ہے لیکن اسلامی حکومت میں یہ نظریہ بالکل باطل ہے۔ اس میں ڈاکٹر، وکلاء، انجنیئر، پائلٹ وغیرہ حکومت کے مشیر ہوتے ہیں، فیصلہ کن اتھارٹی نہیں ہوتے۔ اس میں انجنیئر یہ مشورہ تو دیتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں قسم کا پُل زیادہ مضبوط رہے گا۔ اس امر کا فیصلہ حکومت ہی کرتی ہے کہ پُل کس جگہ بنانا چاہیئے اور کس قسم کا۔ اس میں ایک وکیل یہ تو بتا سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں قانون کیا کہتا ہے۔ قانون بنانا یا قانون کے مطابق فیصلہ دینا، وکیل کا کام نہیں ہوتا۔ یہ اختیارات حکومت ہی کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح، اسلامی حکومت میں، علومِ دین سے واقف حضرات،

حکومت کے مشیر یا اس کی طرف سے متعین کردہ عمال ہوں گے، فیصلہ کن اتھارٹی کے حامل نہیں ہوں گے۔ فیصلہ کا اختیار حکومت ہی کو ہوگا۔ یہ ہے فرق اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں ''علماء'' کی پوزیشن میں۔ اور اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ وہ غلط فہمی ہے جس کا (عوام تو ایک طرف) ہمارے خواص بھی بری طرح شکار ہیں۔ اس غلط فہمی کا موجب خود ہم ہی ہیں جو یہ تصور عام کر رہے ہیں کہ اسلامی حکومت میں ''دین کے معاملات'' میں اقتدارِ اعلیٰ ''علماء'' کو حاصل ہوگا۔ جب تک ہم اس یکسر غیر اسلامی تصور کو مٹاتے نہیں، نہ موجودہ کشمکش دور ہو سکتی ہے، نہ کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی پائیدار حکومت قائم ہو سکتی ہے۔

''علماء کی ضرورت'':۔ ''علماء'' کا طبقہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور ہم (شعوری یا غیر شعوری طور پر) انہیں اہمیت دے دے کر ان کی گرہیں اور مضبوط کئے چلے جاتے ہیں۔۔ اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی اور بھی لاحق ہوتی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ دینی معاملات کے متعلق احکام پہلے سے مرتب شدہ رکھے ہیں اور علماء کو ان کا علم ہوتا ہے، اس لئے جس معاملہ کے متعلق ہمیں معلوم کرنا ہو کہ شریعت کا حکم کیا ہے، اس کے لئے ہمیں لامحالہ علماء کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ وہی جانتے ہیں کہ اس باب میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ یہ کیفیت بھی سیکولر حکومت میں ہوتی ہے جس کا کام دنیاوی امور سے متعلق احکام و قوانین وضع کرنا ہوتا ہے۔ دینی امور کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان سے متعلق تمام احکام پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اسلامی حکومت میں کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں (چند احکام کو چھوڑ کر) ابدی اور غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود مرتب کرے۔ انہیں احکامِ شریعت کہا جائے گا۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام، عند الضرورت، بدلتے رہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے، حکومت کی طرف سے شائع کردہ ضوابطِ قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جن حضرات کو ان ضوابط پر زیادہ عبور ہوگا، انہیں قانون دان کہا جائے گا، لہٰذا، اسلامی حکومت میں، اس مقصد کے لئے بھی، موجودہ تصور کے ''علماء'' کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اسی ضمن میں ایک سوال اور بھی سامنے لایا جاتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ تو بہر حال ایسا ہے جس کی ادائیگی علمائے کرام ہی کریں گے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے تو علماء کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں، لیکن تجدید یادداشت کے لئے اس کا اس مقام پر دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر:۔ اسلام نام ہے اس طریق یا نظام کا جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کو اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ یہ طریق زندگی تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کردہ ہے اور ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا

ہے۔ نہ اسلام کے سوا کوئی اور طریق زندگی اس عظیم مقصد کو پورا کرسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کی ضرورت لاحق ہوسکتی ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کی طرف سے مکمل اور آخری نظامِ حیات ہے۔: ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔ (جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور طریق زندگی اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ ۳/۸۴) سے یہی مراد ہے۔

تمام نوعِ انسان کی طرف رسول:۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی اسلام کی دعوت تمام نوعِ انسان کو دی۔ یعنی یہ دین نہ قومی تھا نہ خاندانی، نہ نسلی تھا نہ وطنی۔ بلکہ ان کی دعوت خون، نسل، رنگ، قوم، زبان، وطن کی حدود و قیود سے ماوراء پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے تھی۔: قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (7:158) ''تم پوری نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' یہ دعوت نہایت حکیمانہ اور حسن کارانہ انداز سے دی جاتی تھی۔: ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة (16:115) اور علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہوتی تھی۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (12:108)۔ جو لوگ اس طرح دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس دعوت کو قبول کر لیتے تھے، وہ اس جماعت کے افراد بن جاتے تھے جو اپنی زندگی اسلام کے مطابق بسر کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔

معروف و منکر:۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے تو جو لوگ (جماعتِ مومنین) اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے، ان پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی تھیں۔ یعنی یہ کہ انہیں فلاں کام ضروری کرنے ہیں اور فلاں باتوں سے رکنا اور بچنا ہے۔۔۔ ان لوگوں کے لئے جن امور کا سرانجام دینا ضروری تھا، قرآن کریم نے انہیں ''معروف'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جنہیں وہ نظام صحیح تسلیم (Recognise) کرتا ہے۔۔۔ اور جن باتوں سے بچنا ضروری تھا، وہ انہیں ''منکر'' کہہ کر پکارتا ہے۔۔ یعنی ایسی باتیں جو اس نظام کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس بات کو افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح جی چاہے ''معروف'' پر عمل کریں اور ''منکر'' سے رکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے متعین کیا جائے کہ ''معروف'' کیا ہے اور ''منکر'' کیا۔ اور ''معروف'' پر عمل کرنے کی شکل کیا ہوگی اور ''منکر'' سے رکنے کا طریق کیا۔ بالفاظِ دیگر، یہ سب کچھ نظم و نسق کے تابع ہوگا۔ اس نظم و ضبط کو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں ''نظامِ مملکت'' کہتے ہیں۔ لہٰذا، ''دین'' اس نظامِ مملکت کا نام ہے جس میں افرادِ مملکت کو اسلام کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ یعنی انہیں ''معروف'' کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور ''منکر'' سے روکا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح اصولی طور پر آئی ہے۔ یعنی معروف اور منکر کی تفصیلات قرآن نے خود مرتب نہیں کر دیں۔ اسے اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ، قرآن کریم کے اصولات، اقدار اور احکام کی روشنی میں ''معروف اور منکر'' کی جزئیات اور تفصیلات خود متعین کرے۔ آگے بڑھنے سے پہلے دو تین باتوں کا دہرا لینا ضروری ہے جو تصریحاتِ بالا سے مستنبط ہوتی ہیں۔ یعنی:۔

(۱)۔ اسلام کی طرف دعوت، تمام نوعِ انسان کو دی جائے گی۔ یہ صرف ''دعوت'' ہوگی، حکم نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اسلام کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے گا اور اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ چاہے اسے اختیار کر لیں، چاہے اس سے انکار کر دیں۔

(۲)۔ جو لوگ، بطیّبِ خاطر، دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ، اس دعوت کو حق سمجھ کر اختیار کر لیں گے، وہ جماعتِ مومنین کے افراد بن جائیں گے۔

(۳)۔ یہ جماعت ایک نظامِ مملکت کے تابع زندگی بسر کرے گی جو انہیں ''معروف'' کے مطابق چلنے اور ''منکر'' سے رکنے کے لئے ضروری احکام نافذ کرے گا۔

نظم وضبط:۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان احکام سے یہ مطلب نہیں کہ وہ نظامِ مملکت افراد کی زندگی کو قدم قدم پر قانون کی زنجیروں میں جکڑ دے گا۔ چونکہ یہ جماعت وہ ہوگی جس نے اچھی طرح سمجھ سوچ کر، قلب اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس طریقِ زندگی کو اختیار کیا ہوگا، اس لئے معروف کے اتباع اور منکر سے اجتناب کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ ان کا ہر قدم، بلا تکلف و بلا تامل، از خود، معروف کے مطابق اٹھے گا اور منکر سے رکے گا۔ اس طریقِ زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہی یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار کو اس سانچے میں ڈھال دے جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس مملکت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' در حقیقت معاشرہ میں نظم وضبط کے لئے ہوگا۔ اب آگے بڑھیئے!

حضور ﷺ کا فریضہ:۔ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، نبی اکرم ﷺ کا ایک فریضہ یہ تھا کہ نوعِ انسان کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس اعتبار سے حضور ﷺ ''**دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ**'' (33:46) وراولین مبلّغِ اسلام تھے (۵/۶۷)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کا فریضہ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' بھی تھا۔ یامرون بالمعروف ینھٰھم عن المنکر (۷/۱۵۷)۔ پہلا فریضہ عام انسانوں (غیر مسلموں) کو اسلام کی دعوت دینے کا تھا۔ دوسرا فریضہ اسلامی مملکت میں ''معروف'' کو حکماً نافذ کرنے اور منکر سے حُکماً روکنے کا۔

اُمت کا فریضہ:۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد یہ دونوں فرائض اُمت کی طرف منتقل ہو گئے۔ یعنی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دینا، اور اسلامی مملکت میں ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر''۔ (چونکہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر موضوع۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔۔ ہے اس لئے ہم سردست پہلے فریضہ (تبلیغ و دعوت) کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)۔ اس فریضہ کے متعلق کہا گیا: **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41)۔ یہ وہ لوگ

ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام کام، انجامِ کار، اللہ کے لئے ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ:۔ (۱)۔ اقامتِ صلوٰۃ، (۲)۔ ایتائے زکوٰۃ، (۳)۔ امر بالمعروف اور (۴)۔ نہی عن المنکر ہوگا۔ (اس وقت ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے بھی تمکن فی الارض (اسلامی حکومت) ضروری ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے)۔ اور چونکہ اسلامی حکومت پوری کی پوری امت کی ہوتی ہے (وامرھم شوریٰ بینھم۔ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے ہوتی ہے) نہ کہ کسی خاص فرد یا گروہ کی، اس لئے اس فریضہ کو پوری امت ادا کرتی ہے، ان کی کوئی خاص جماعت نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے دیگر مقامات پر اس کی واضح الفاظ میں تصریح کر دی ہے۔ سورہء آل عمران میں ہے:۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ (3:110)۔ ''تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو (اس لئے کہ) تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو'' اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ سورہء توبہ میں ہے:۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (9:71)۔ ''مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں۔ یہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے، کسی خاص گروہ کا نہیں۔ حتیٰ کہ اس میں مومن عورتیں بھی، مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر، عام مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس ضمن میں کہا گیا ہے:۔ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ (9:112)۔ ''وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں۔'' تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ:۔ (۱)۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمام امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔ (۲)۔ یہ امت اس فریضہ کو حکومت کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔ حکم (امر) ایک حکومت ہی دے سکتی ہے۔ اور حکومت ہی کسی کو غلط باتوں سے روک سکتی ہے۔ ''روکنے'' کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ع:۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

PROPERTY FOR SALE

25 - B, Gulberg 2, (Ch. Zahoor Elahi Road) Lahore
(Adjacent to Tolu-e-Islam Trust Building) Area: 2 Kanal Plus -- Corner Plot
Interested parties may contact for further

details: Nadeem Pervaiz: 03334118829
Saleem Pervaiz: 03249883033 (NO Property Dealers Please)

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ آزاد کشمیر)

دوسری قسط

تخلیق کی نور افشانی

Glow of Creation

سائنسی موضوعات میں گیمو کی دلچسپیوں کا دائرہ کار بڑا وسیع تھا۔ اُس نے ستاروں کے نظریات (Theory of stars) پر بھی کام کیا، بائیولوجی پر بھی تحقیق کی اور پاپولر سائنس پر بھی بہت کچھ لکھا۔ مگر یہ کاسمولوجی کا موضوع تھا جس میں اسے شہرت ملی۔ مارکس نے اس کے بارے میں بڑی غیر معمولی رائے دی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ:

"Gamow was wrong about almost everything. But his achievement was immens for he was the first person to take the big bang really seriously and use nuclear physics to pridict what the earliest moments of creation were like. Decads later others following his lead, would go on to speculate about the firist split second of the big bang."

گیمو کے شاگرد الفر نے پروٹانز، نیوٹرانز اور الیکٹرانز کے ابتدائی مرکب محلول (Mixture) کی وضاحت کے لئے 'YLEM' کی اصطلاح وضع کی تھی۔ گیمو نے بہت پہلے محسوس کرلیا تھا کہ 'Ylem' صرف انہی ذرات (Particles) پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں ریڈی ایشن بھی شامل ہے۔ کیونکہ مادہ جس درجہ حرارت میں ہو، ریڈی ایشن خارج کرتا ہے اور درجہ حرارت جتنا زیادہ ہوگا ریڈی ایشن کی توانائی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ چنانچہ ایک ارب ڈگری سنٹی گریڈ درجہ حرارت پر مادے سے طاقتور گاما ریز خارج ہوگی۔ لہٰذا ابتدائی کائنات یقیناً بہت ہی تاباں اور درخشاں ہوگی۔ 1946ء میں گیمو اور الفر مختلف ایٹموں پر تحقیق کرتے ہوئے ان کی مقدار کے اعداد و شمار جمع کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ان کے ساتھ پرنسٹن سے ایک طالب علم رابرٹ ہرمن بھی شامل ہوگیا۔ دوران تحقیق الفر اور ہرمن کو ایک ایسی بات سوجھی جو گیمو کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ بگ بینگ کی یہ باقیات (Relic) ابھی تک کائنات میں موجود ہونی چاہئے۔ وہ اپنے اس نظریئے پر مزید تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات کے پھیلاؤ کی وجہ سے مائیکرو ویوز کا درجہ حرارت گر کر $-268\ C^{\circ}$ ہوگا۔ انہوں نے 1948ء میں اپنی پیش گوئی کو شائع بھی کر دیا مگر گیمو نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کا کہنا تھا کہ مائیکرو ویوز ریڈی

ایشن کی کائنات میں موجودگی کا امکان تو ہے لیکن یہ زمین سے دیکھی نہیں جاسکتی۔ کافی بحث ومباحثہ کے بعد آخر کار گیمو بھی اُن سے متفق ہوگیا مگر کسی دوسرے سائنسدان نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور سائنسی دنیا میں یہ پیش گوئی بیس سال تک تقریباً نابود رہی۔

بیس سال بعد 1960ء کی دھائی میں ایک نئے کردار کے سامنے آنے کے بعد گیمو اپنے دیگر ساتھیوں سمیت پس منظر میں چلا گیا۔ اسٹیج پر نئے کرداروں کے آنے سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اوراس نئے دور کی ابتداء بوب ڈائیک (Bob Dike) نے کی ان کا تعلق پرنسٹن یونیورسٹی سے تھا اور گیمو کی طرح یہ بھی ہمہ جہتی سائنسدان تھے۔ ان کی تربیت تو 'Atomic physicist' کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن انہوں نے نیوٹن کی کشش ثقل تھیوری کے علاوہ آئن سٹائن کے نظریہ عمومی اضافیت پر بھی تجربات کئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ریڈار کی ترقی میں انہوں نے اہم رول ادا کیا تھا۔ انہوں نے کاسمولوجی میں بھی دلچسپی لی۔ بگ بینگ کے نظریے نے انہیں بڑا پریشان رکھا تھا۔ وہ دراصل اس سوال کا حل چاہتے تھے کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا۔ یہ ایسا سوال تھا جس کو سن کر سائنسدان پہلوتہی کرتے تھے۔ لیکن ڈائیک نے اس سوال پر تحقیق شروع کر دی اور نتیجے کے طور پر انہوں نے جھولتی ہوئی کائنات (oscillating or Bouncing Univers) کا تصور وضع کیا۔ اس معاملے میں مختصر طور پر ان کا کہنا ہے کہ کشش ثقل کی وجہ سے ایک ایسا وقت آئے گا جب پھیلتی ہوئی کائنات رک جائے گی اور پھر سکڑنا شروع ہو جائے گی یہاں تک کہ

"All of creation would embark on a runway collaps until matter was crushed to the maximum density possible."

مادے کی یہی سکڑی (Compressed) ہوئی حالت ہی بگ کرنچ (Big Crunch) ہے۔ یعنی

"A big crunch - That The Universe around us was 'rebounding' today."

ڈائیک کے مطابق بگ بینگ کا دھماکہ کوئی منفرد یا مخصوص دھماکہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی بے شمار دھماکے ہو چکے تھے اور آئندہ بھی اسی طرح بگ بینگ دھماکے ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا کائنات کی کوئی ابتدا ہے ہی نہیں۔ مارکس کے الفاظ میں:

"There had been another big bang, and before that another. The universe had no beginning. It had been pulsating through the mists of time.....oscillating universe like steady state universe neatly side stepped the sticky problem of what happend before big bang."

مارکس نے آگے چل کر اس پر مزید بحث کی ہے جو خاصی طویل ہے اور ہمارے موضوع سے بھی غیر متعلقہ ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کا ذِکر کر دینا مناسب رہے گا کہ بگ بینگ سے پہلے کے حالات کے بارے میں سوال کا حل یہ بھی نہیں ہے۔ جتنا بھی پیچھے

جائیں ابتدا بہرحال کہیں سے تو ہوئی ہوگی۔

مارکس نے کہا ہے کہ لرزتی ہوئی کائنات کے تصور نے سٹیڈی اسٹیٹ کائنات کی طرح بگ بینگ سے پہلے کیا تھا کے سوال کو حل کر دیا ہے۔ سٹڈی اسٹیٹ کائنات کا تصور 1948ء میں فریڈ ہائل نے وضع کیا تھا۔ جس کے مطابق کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ موجود رہے گی۔ مارکس نے خود اس تصور کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بگ بینگ اور سٹڈی اسٹیٹ نظریوں کے درمیان ڈیڑھ عشرے تک دو گھوڑوں میں دوڑ کی طرح سخت مقابلہ رہا لیکن 1960ء کی دہائی میں بگ بینگ کا گھوڑا جیت گیا۔ اسٹیفن ہاکنگ کا بھی یہی کہنا ہے کہ دیگر کئی وجوہات کے علاوہ مائیکرو ویوز کی دریافت کے بعد سٹڈی اسٹیٹ نظریے کو ترک کر دیا گیا۔ ان کے الفاظ میں:۔

"Moreover, the discovery of Microwave readiation by Perzias and wilson in 1965, also indicated that the Universe must have been much denser in the past. The steady state theory therefore had to be abandoned."

اسٹیفن خود بھی کائنات کی ابتداء کو نہیں مانتے مگر وہ فرضی وقت میں ہی ایسا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے لرزتی ہوئی کائنات کا ذکر نہیں کیا لیکن ویٹی کن میں پوپ سے ایک رسمی ملاقات میں جب پوپ نے کہا کہ ''بگ بینگ کے بعد' کائنات کا مطالعہ تو ٹھیک ہے مگر ہمیں خود بگ بینگ کی تفتیش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ یہ تخلیق کا لمحہ تھا۔ اور اسی لئے خدا کا عمل تھا'' یہ سن کر سٹیفن نے اپنے ردِعمل کا یوں اظہار کیا۔ ''میں خوش تھا کہ پوپ کو کانفرنس میں میری گفتگو کے موضوع کا علم نہیں تھا جو مکان۔ زمان میں تو متناہی مگر ان کی کوئی حد نہ ہونے کے امکان کے بارے میں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی کوئی ابتداء نہیں تھی اور نہ ہی تخلیق کا کوئی لمحہ تھا۔ میں گلیلیو کے مقدر میں حصے دار بننے کی کوئی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا''۔ تخلیق کے لمحے سے پوپ کی مراد بگ بینگ سے پہلے کے حالات تھے۔ جن کے بارے میں آج تک کوئی جان سکا ہے اور نہ آئندہ سمجھ سکے گا کیونکہ ان معاملات کا تعلق عالمِ امر سے ہے جنہیں سمجھنے کی صلاحیت انسان کو دی ہی نہیں گی۔

سائنسدانوں کی اکثریت کا بھی یہی خیال ہے کہ بگ بینگ سے پہلے کے حالات کا علم حاصل ہونا ممکن نہیں۔ خود اسٹیفن کا بھی کہنا ہے کہ ''اضافیت کے عمومی نظریئے کے مطابق کائنات بگ بینگ کی اکائیت پر لامتناہی کثافت (infinite density) سے شروع ہوئی۔ اکائیت پر عمومی اضافیت کے اور دوسرے تمام طبیعی قوانین ناکارہ ہو جائیں گے۔ اور یہ پیش گوئی نہیں کی جا سکے گی کہ اکائیت (Singularity) کے بعد کیا برآمد ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بگ بینگ اور اس سے پہلے کے واقعات کو نظریے سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے زیرِ مشاہدہ واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے''۔ مارکس شان بھی تخلیق کے لمحے کو تسلیم کرتے ہیں۔

"There must have been a moment when the headlong expansion started. The moment of the universe's birth."

میں نے اپنے مضمون ''بگ بینگ سینگولیرٹی میں کئی آیات کے حوالے سے لکھا تھا کہ قرآن کے مطابق کائنات ایک خاص وقت میں تخلیق کی گئی ہے اور اس کا ایک خالق ہے۔ ڈاکٹر دلدار احمد قادری نے ''کائنات' قرآن اور سائنس'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے وہ اس باب میں لکھتے ہیں ''یہ بات کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں بلکہ اسے تخلیق کیا گیا ہے قرآن حکیم کے بنیادی دعوؤں میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جس نے اسے ایک خاص وقت (At a definite time moment) میں عدم سے پیدا کیا''۔ ڈاکٹر قادری کی کتاب کا پیش لفظ ملک کے مشہور و معروف سائنسدان ڈاکٹر پروفیسر عطاء الرحمٰن نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا نے قرآن میں کائنات کے بارے میں کچھ تصورات اور اشارات دیئے ہیں۔ چنانچہ وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں ''قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے اپنے آخری نبیؐ پر بھیجی۔ قرآن میں کثرت سے ایسے اشارے موجود ہیں جو سماوی کائنات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے روشنی کا منبع ہیں۔۔۔۔ اپنے موضوع پر یہ کتاب نہایت مفید اور منفرد کاوش ہے جس میں کائنات کے قرآنی تصور کے حوالے سے نہایت اہم اور بنیادی مباحث زیر غور لائے گئے ہیں''۔ ڈاکٹر قادری کہتے ہیں کہ ''سائنسدانوں کے مطابق ہم کائنات کی تاریخ کو صفر وقت یعنی اس قلیل ترین لمحہ وقت سے جب کائنات کا آغاز ہوا' شروع نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے سائنسی قوانین اس صورت حال کو جو اس وقت تھے بیان نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں انہوں نے "Machael.A.Seeds" کی کتاب 'Horizons' کا ایک اقتباس بھی دیا ہے۔ ڈاکٹر مائیکل بھی یہی کہتے ہیں کہ

"We cannot begin our history at time zero, because we do not understand the physics of matter and energy under such extreme conditions, but we can come close."

بل برائسن کا بھی کہنا ہے کہ ''بہت سے حساب کتاب اور ذرّے کی رفتار کو بڑھانے کے اثرات کے مشاہدے کے بعد سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ تخلیق کائنات کے 10^{-43} سیکنڈز تک مراجعت کر سکتے ہیں جب کائنات اتنی چھوٹی تھی کہ اسے دیکھنے کے لئے خوردبین کی ضرورت تھی۔

بات مائیکرو ویو یا خوردموج کی ہو رہی تھی۔ بوب ڈائیک کے سامنے آنے کے بعد اس شعاع کاری کی دریافت کی کوششوں میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ ریڈار کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے ڈائیک کے پاس مائیکرو ویو کے متعلق کافی معلومات تھیں۔ اس کی پیش گوئی تھی کہ کائنات میں پھیلاؤ کے سبب اس ریڈی ایشن کا درجہ حرارت بہت ہی کم ہو گیا ہوگا' اس لئے یہ اب گاما ریز کی شکل میں نہیں بلکہ شارٹ ویولینتھ ریڈیو ویوز کی صورت میں نمودار ہوتی ہوگی۔ یہ حقائق تو پہلے سے معلوم تھے لیکن ڈائیک کے ذہن میں ایک ایسی بات بھی آ گئی جو گیموؤ الفر اور ہرمن وغیرہ کے ذہن میں نہیں آئی تھی وہ یہ کہ

"That there was good chance of detacting such rediation in the universe today."

پرنسٹن میں ڈائیک کے"Gravity group" میں دونو جوان سائنسدان ڈیوڈ ولکنسن اور پیٹر رول بھی کام کر رہے تھے۔ ڈائیک ان کا انچارج تھا ایک دن اس نے ولکنسن سے کہا برخوردار! "You know there might this relic rediation in the universe. یہ سن کر ولکنسن اور رول (Roll) بھی اس ریڈی ایشن کی تلاش کے لئے بڑی خوشی سے تیار ہو گئے۔ کائنات میں پھیلی ہوئی دیگر اِقسام کی شعاعوں سے اس شعاع کو پہچاننا آسان تھا کیونکہ

"The relic rediation would have two unique and striking characteristics. First because it permeated every pore of space, it would appear to be coming from every where in the sky. Secondly, it would have the spectrum of black body."

مائیکرو ریڈی ایشن بہت ٹھنڈی ہو چکی ہے اس لئے اب یہ ایک سینٹی میٹر اور ایک میٹر کی طول موج والی شارٹ ریڈیو لہروں کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے بڑی دوربین کی ضرورت نہیں البتہ اس کے لئے آپ کو کائنات کا درجہ حرارت لینا پڑے گا۔ 1946ء میں ڈائیک نے ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس سے آسمان سے آنے والی شعاعوں کی پیمائش کی جاتی تھی۔ بعد میں اِس آلہ کو ڈائیک ریڈیومیٹر کا نام دیا گیا۔

بعد ازآں ابتدائی تیاریوں کے مکمل ہونے پر ڈائیک نے مائیکرو ویو کی تلاش کیلئے اپنے دونوں شاگردوں ولکنسن اور رول کو ایک دوربین بنانے کا کام تفویض کر دیا۔ ڈائیک ایسا آلہ جنگ کے دوران بنا بھی چکا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ "I gave them advice and they went and did all the work of soldering."

ڈائیک نے اپنے اس پروجیکٹ میں ایک تیسرے سائنسدان 'Jim Peebles' کو بھی شامل کر لیا جس کی ذمہ داری اس ریڈی ایشن کا موجودہ درجہ حرارت معلوم کرنا تھی۔ اس پروجیکٹ کے لئے انہوں نے پرنسٹن میں ہی جیالوجی کے گاؤٹ ہال کی چھت منتخب کی۔ ان کے آلات میں انٹینے (Antenna) کی سب سے اہم حیثیت تھی کیونکہ خلا سے آنے والی ریڈیو ویوز کو اسی آلے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس ٹیم کے لئے سب سے مشکل کام یہی تھا کیونکہ انہیں ایسا اینٹینا تیار کرنا تھا جو انتہائی حساس بھی ہو اور ایسے نمونے اور ٹیکنیک سے بنا ہو جو زمین یا کسی نزدیکی گرم جرم (object) سے نکلنے والی شعاعوں کو قبول نہ کرے۔

اس قسم کا اینٹنا بنانے میں انہیں ایک خاص پرزے (Device) یعنی 'Cold load' کی بھی ضرورت تھی۔ کیونکہ اس انٹینے کو

انتہائی ٹھنڈی چیز تلاش کرنی تھی جو عام روائتی ریڈیو دوربین سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ عام طور پر ماہرین فلکیات ایسی شعاعوں کو تلاش کرتے ہیں جن کا ایک خاص سرچشمہ (Source) ہوتا ہے۔ لیکن اس ٹیم کو ایسی ریڈیو ویوز کا مشاہدہ کرنا تھا جس کا سورس کسی خاص جگہ نہیں بلکہ پورا آسمان تھا۔

"The big bang rediation was the background sky so it would be impossible to look away from ordinary telescope."

ٹیم کو ابھی ایک اور مشکل مرحلہ درپیش تھا اور وہ تھا مائیکرو ویو کے درجہ حرارت کے ماپنے کا مرحلہ کیونکہ درجہ حرارت ماپتے ہوئے مختلف اشیا کے درجہ حرارت گڈمڈ ہوجاتے ہیں جن کو الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ان کو ایک مصنوعی سورس آف ریڈیو ویوز یعنی کولڈ لوڈ بنانا تھا جس کا ایک معین درجہ حرارت ہو۔ اس طرح وہ اپنے انٹینے کا رخ آسمان کی طرف موڑ کر ریڈیو ویوز کی توانائی نوٹ کرنے کے بعد اس کا رخ اپنے بنائے ہوئے آلے ''کولڈ لوڈ'' کی جانب کرکے دوسری ریڈنگ لیں گے۔ اب ایک ریڈنگ کو دوسری ریڈنگ سے منہا کرکے معلوم کرلیں گے کہ آسمان کے درجہ حرارت میں اور مصنوعی کولڈ لوڈ کے درجہ حرارت میں کتنا فرق ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس مصنوعی سورس کے درجہ حرارت کو بگ بینگ ریڈی ایشن کے درجہ حرارت کے قریب ہونا چاہئے یعنی مطلق صفر سے تین ڈگری سے دس ڈگری تک اوپر ہونا ضروری ہے۔ اپنے کولڈ لوڈ کو اس قدر ٹھنڈا رکھنے کے لئے انہوں نے مائع ہیلیم (Liquid helium) استعمال کیا۔ جو ہمیشہ 4.2 ڈگری 'C' پر کھولنا شروع ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ریڈیو ویوز کے اس مصنوعی سورس کو 'cold load' کہا جاتا ہے۔ مارکس کے الفاظ میں:

"Wilkinson and roll arranged their instrument so that it switched from looking at the sky, Then at the cold load, Then back at the sky again, and this was repeated very rapidly. The electrical device that made this possible was called a 'Dike switch,' Dike, it seemed, had invented vertually everything in the field of microwave astronomy."

کولڈ لوڈ کو ڈیزائن کرنے کی ذمہ داری پیٹر رول کو سونپی گئی۔ اس میں اہم بات یہ تھی کہ اسے ایسی ٹیکنیک سے بنایا جائے تاکہ اس پر پڑنے والی تمام ریڈیو ویوز اس میں جذب ہوجائیں کوئی شعاع منعکس (Reflect) نہ ہونے پائے۔ ورنہ اینٹینے اور کولڈ لوڈ کا ٹمپریچر گڈمڈ ہوجائے گا۔ اسی طرح کے نازک اور مشکل آلات انہوں نے کامیابی سے بنا کر انٹینا مکمل کرلیا۔

مارکس کے خیال میں انہوں نے ایسی جدید اور ٹیکنیکل دوربین ایجاد کی جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں تھی۔

'A telescope like no other in the world.—the telescope wilkinson and roll were assembling had two features unique in the world: a cold load and an antenna carefully designed to reject radio waves from ground."

ٹیم کے خیال میں دنیا میں کوئی دوسرا آلہ (instrument) بگ بینگ کی شعاع کاری کو تلاش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دراصل اس وقت تک اکثر لوگوں نے بیگ بینگ کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ ابھی تک فریڈ ہائل کی وضع کردہ سٹڈی سٹیٹ تھیوری کو درست نظریہ سمجھتے تھے۔ سٹڈی سٹیٹ کا نظریہ فریڈ ہائل نے اپنے دو ساتھیوں سمیت مشترکہ طور پر 1948ء میں پیش کیا تھا۔ اس نظریے کی بنیاد تین پیش گوئیوں پر تھی۔ ایک یہ کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ دوسری یہ کہ کائنات میں نئی نئی تخلیقات کا اضافہ ہو رہا ہے اور تیسری بات یہ تھی کہ کائنات ہمیشہ سے موجود رہی ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی۔ فریڈ ہائل بگ بینگ نظریے کا سخت مخالف تھا اور اکثر اوقات اس کا مذاق بھی اڑاتا رہتا تھا۔ تاہم بعد کی تحقیقات نے اس کی پہلی دو پیش گوئیوں کو درست قرار دیا لیکن اس کی تیسری پیش گوئی کو مسترد کر دیا۔ اس نظریے کی موجودگی میں ولکنسن اور پیٹر رول کبھی کبھی مایوس بھی ہو جاتے تھے کہ جب بگ بینگ واقع ہی نہیں ہوئی تو اس کی ریڈی ایشن کہاں ہوگی؟ مگر ان کا لیڈر ربوب ڈائیک ایسے مایوس لمحات میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کے رجائیت پسندانہ رجحانات کو ابھار کر ان میں امید کی کرن پیدا کرتا۔ یوں ایک وقت ایسا آ گیا کہ ان کی کامیابی کے آثار واضح طور پر سامنے آنے لگے۔ وہ بھی اپنی اس متوقع کامیابی پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے۔ ناامیدیوں اور مایوسیوں کا دور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ یقیناً ایک عہد ساز (Epoch-making) دریافت کے بہت قریب پہنچ چکے تھے کہ ایک دن اچانک ڈائیک کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کیا بجی بس یوں سمجھئے کہ ''لائن کٹ گئی''۔

گذشتہ کچھ عرصے سے ان کا معمول تھا کہ ولکنسن، پیٹر رول اور پیبلز (Peebles) ہفتے میں ایک دن ڈائیک کے دفتر میں اکٹھے ہوتے اور اپنے لیڈر سے پروگرام کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے۔ وہ اپنے مکمل شدہ کام کا جائزہ لیتے اور آئندہ کی ضروریات کے پیش نظر اپنا منصوبہ تیار کرتے اور لنچ کرتے۔ آج بھی وہ ضروری گفتگو سے فارغ ہو کر سینڈوچز کے ساتھ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ ڈائیک نے فون اٹھایا۔ پہلے تو کسی نے ادھر دھیان نہیں دیا لیکن جب کال قدرے لمبی ہو گئی تو سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ گفتگو زیادہ تر یک طرفہ ہی تھی۔ ڈائیک زیادہ تر سنتا ہی رہا۔ کبھی کبھار ہوں ہاں اور کبھی نفی یا اثبات میں اپنا سر ہلا دیتا۔ ایک بار ولکنسن نے ڈائیک کے منہ سے بڑبڑاتے ہوئے 'Horn Antenna' کے الفاظ سنے۔ یہ سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے کہ گفتگو واقعی کسی سنجیدہ اور اہم مسئلے پر ہو رہی ہے۔ بات چیت نہ سننے کے باوجود سب کی نگاہیں ڈائیک کی طرف تھیں۔ ان کے لئے واقعی بڑا نازک اور ڈرامائی وقت تھا۔ مگر

"On the telephone, Dike continued to repeat familiar microwave phrases. Then suddenly he said, 'cold load'. 'As soon as we heard those words, we knew that the game was up', says wilkinson."

بل برائیسن نے بھی اس ٹیلیفون کال کا ذِکر کیا ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ڈائیک کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ دونوں نوجوانوں کو کیا مل گیا ہے۔ ''میرے دوستو''! اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا جبکہ وہ فون کا چنگارکھ رہا تھا۔ ''ہم دیکھتے رہ گئے بازی کوئی اور لے گیا''۔

بوب ڈائیک کو یہ کال بیل لیبارٹریز کے نوجوان ماہر فلکیات آرنو پنز یاس (Arno Penjias) کی طرف سے موصول ہوئی تھی۔ یہ نازی جرمنی سے ہجرت کر کے امریکہ آیا تھا۔ 1963ء میں اس نے ایک دوسرے نوجوان ماہر طبعیات رابرٹ وِلسن کے ساتھ مل کر ایک غیر معمولی ریڈیو انٹینے پر تحقیق کام شروع کیا تھا۔ یہ انٹینا بیل لیبارٹریز نے اپنی سائٹ ہولمڈل (Holmdel) نیوجرسی میں ڈیزائن کیا تھا۔ اِس مواصلاتی انٹینے کا مقصد سیٹلائٹ کمیونیکیشن کے بارے میں تحقیق کرنا تھا۔ یہ انٹینا پرنسٹن سے صرف تیس میل کے فاصلے ''پر کرافورڈ ہل'' (Crawford hill) پر نصب تھا۔ یہ انٹینا دوسرے معروف ریڈیو ڈش کی طرح نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بلکہ ایک دیوہیکل آئس کریم کون (Cone) کی طرح کا تھا۔ بقول مارکس

"But a better discription might be a giant icecream cone laid on its size/ A 20 foot - Square opening had been cut in the side of the cone, just beneath where the icecream should have gone."

آسمان سے آنے والی مائیکرو ویو اسی سوراخ (Opening) میں اکٹھی ہوتی تھی۔ اس میں ایک نہایت ہی حساس ریڈیو رسیور بھی فٹ تھا۔ پورے انٹینا کو دو الگ الگ محوروں (Axes) پر گھمایا جا سکتا تھا تا کہ سوراخ آسمان کے کسی حصے کی طرف اشارہ کر سکے۔ ریڈیو ویوز کی پیمائش کرنے والی دیگر ٹیموں کی طرح بیل لیبارٹریز والی ٹیم کو ایک اہم مسئلے کا سامنا تھا۔ وہ یہ کہ مواصلاتی سیارے سے منعکس ہونے والے ریڈیو سگنلز میں نزدیکی اجسام سے نکلنے والی غیر ضروری ریڈیو ویوز کی بھرمار ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے سیارے کی ریڈیو ویوز کی درست پیمائش نہیں ہو سکتی۔ اس کے حل کے لئے بیل لیب نے اپنے بیس فٹ اونچے انٹینا کی ساخت آئس کریم کون کی طرز پر رکھی تھی۔ اس طرح زمین سے نکلنے والی ریڈیو ویوز کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنا رخ موڑ کر اس کے سوراخ (Opning) میں داخل ہو سکیں۔ وِلسن کا کہنا تھا کہ ہمارا بیس فٹ انٹینا یقیناً منفرد ہے کیونکہ

"It produced very little in the way of unwanted radis signals, and there was the possibilities of exact determining exactly how big these signals were."

پرنسٹن والوں کی طرح یہاں بھی پینز یاس نے ہیلیم کے استعمال سے 'کولڈ لوڈ' تیار کیا تھا۔ بقول مارکس

"In 1964, it was probably to say that there were only two liquid helium cold loads in the world."

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر ان دو ٹیموں نے جداگانہ حیثیت سے یہ کولڈ لوڈز بنائے تھے۔ دیگر کئی معاملات میں بھی ان کے آلات میں مشابہت پائی جاتی تھی۔ تاہم دونوں کے مقاصد الگ الگ تھے۔ بیل لیب والے مائکرو ویوز کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بہرحال انہوں نے 1964ء کے جون کے مہینے تک اپنے انٹینے کو ہر پہلو سے مکمل کر دیا تھا اور اب وہ "Fully expected to measure a sky temperature of zero degrees.

لیکن ان پر یہ جلدی ہی واضح ہوگیا "That some thing was very wrong" ان کے انٹینے کا بگل (Horn) ان کی توقع سے زیادہ ریڈیو سگنلز مہیا کر رہا تھا۔ وہ جدھر بھی انٹینے کا رخ کرتے انہیں ایک ''سی سی'' طرز (Like Hiss) کی مسلسل آواز سنائی دیتی اس متواتر آواز نے انہیں بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس عجیب وغریب آواز کی وجہ معلوم کرنے کے لئے انہوں نے تمام اہم آلات کولڈ لوڈ، ایمپلی فائر سرکٹس، اینٹنا وغیرہ کو بار بار چیک کیا۔ انہوں نے اس خطرے سے بھی اطمینان حاصل کر لیا کہ یہ سگنل کسی نزدیکی 'object' سے آ رہا ہو۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود ناکامی کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ پورے انٹینا کی دوبارہ جانچ کی جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے انٹینے کی صفائی شروع کر دی۔ صفائی کے دوران انہیں انٹینے کے اندر کبوتروں کا ایک جوڑا نظر آیا۔ وہاں ان کی 'بیٹ' تھی۔ بقول مارکس "The pigeons had left their distinctive mark on the inside of cone." پنز یاس جو ایک ریڈیو انجینئر تھا' کے نزدیک یہ بیٹیں 'White electrical material' (وائٹ الیکٹریکل میٹریل) تھا جو عام جانوروں کی بیٹ (Shit) تھی۔ انہوں نے کبوتروں کو تو بیل لیب سائٹ نیو جرسی بھیج دیا اور آئس کریم کون کو اس گند سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ صفائی میں مصروف تھے کہ تیسرے دن ان کو وہی کبوتروں کا جوڑا اینٹنے کے اندر دکھائی دیا۔ دراصل نیو جرسی میں ایک شخص نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا تھا اور وہ چالیس میل کا طویل سفر کر کے واپس اپنی جگہ آ گئے تھے۔ جانور یا پرندے جبلی طور پر اپنا مقام اور راستہ معلوم کر لیتے ہیں۔ انہی جبلی اعمال کو قرآن مجید میں وحی 16:68 یا قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہ 24:41 کہا گیا ہے۔ ان کبوتروں کو مشین شاپ میں کام کرنے والے ایک نوجوان نے 'شوٹ' کر دیا۔ مارکس نے انہیں سائنسی شہید قرار دیا ہے۔ "They died for science"۔ پنیز یاس اور ولسن نے پوری صفائی کے بعد بھی دیکھا کہ وہ آواز اسی طرح آ رہی ہے۔ اب ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

بل برائسن نے ان کی پریشانی کا احوال یوں بیان کیا ہے۔ ''انہیں پس منظر سے ایک مسلسل آواز سے پریشانی ہو رہی تھی۔ یہ ایک مسلسل آواز تھی اور اس طرح آ رہی تھی جیسے کہیں بھاپ خارج ہو رہی ہو۔ اس سے ان کے تجرباتی کام میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔ یہ آواز کھچاوٹ پیدا کرتی اور اس کی کوئی سمت نہیں تھی۔ دن رات یہ آواز آسمان کے ہر گوشے سے بلند ہوتی اور تابڑ توڑ ان کے ذہنوں

پر کوڑے کی طرح برستی۔ نہ اس پر موسم کا اثر تھا اور نہ ہی وقت کی حدوں کا۔ فلکیات کے دونوں ماہر سال بھر اس آواز کے منبع کو نہایت جانفشانی سے ڈھونڈتے رہے تا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ انہوں نے بار بار بجلی کی تاروں کا معائنہ کیا۔ پرانے آلات کو ہٹا کر نئے آلات لگائے۔ سرکٹس چیک کئے۔ تاروں کو سروں سے صاف کیا پلگوں کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ حتیٰ کہ وہ بنفس نفیس ڈِش کے اندر گئے اور ہر ایسی جگہ جو دھاتی تھی یا جہاں کوئی جوڑ تھا اس کو ٹیپ سے اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ ایک بار پھر وہ جھاڑو اور برش لے کر ڈِش میں داخل ہوئے اور نہایت مستعدی سے یہاں سے ''وائیٹ الیکٹریکل میٹریل'' یعنی سفید برقی مادے کو جسے سادہ الفاظ میں پرندوں کی بیٹ کہتے ہیں ہٹایا لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوتا''۔ مارکس مائیکر وویو کی تلاش میں پرنسٹن ٹیم کے بارے میں کہتے ہیں کہ ڈائیک نے فائر بال ریڈی ایشن کی تلاش کے لئے دو ماہرین فلکیات کی ذمہ داری لگائی لیکن

"On the eve of their attempt (and here the story descends in to force?), another pair of astronomers stumlbed on the cosmic back-ground radiation entirly by accident. After first thinking they might be seeing the radio glow of pigeon dropping. It is a strange tale."

اس آواز کی ایک اور منفرد خصوصیت تھی۔ یعنی

"The hiss was strongest when the antenna was pointed at the horizon - The direction in which the atmosphere is thickest - and weakest when it was pointed straight up - where the atmosphere is at its thinnest."

چونکہ یہ ریڈیو سگنل پورے آسمان سے متواتر آ رہا تھا اس لئے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ آواز سورج یا ہماری کہکشاں سے آ رہی ہے کیونکہ سورج یا کہکشاں پورے آسمان کا احاطہ تو نہیں کرتے۔ اب دوسرا متبادل امکان تو یہی رہ جاتا تھا کہ یہ سگنل تمام کا تمام (As a whole) پوری کائنات سے آ رہا ہے۔ مگر But These astronomers knew of no astronomical source that could be generating such a constant radio signal."

درحقیقت پنزیاس اور ولسن نہ ہی کاسمک بیک گراؤنڈ ریڈی ایشن کی تلاش میں تھے اور نہ ہی اس کے متعلق انہیں کچھ علم تھا۔ وہ اس بات سے بھی قطعی طور پر لاعلم تھے کہ اُن سے صرف تیس میل دور پرنسٹن میں ڈائیک کی راہنمائی میں سائنسدانوں کی ایک ٹیم اس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس سے وہ جان چھڑانے کے لئے گذشتہ ایک سال سے پریشانی کی حالت میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ آخر کار ہر طرف سے مایوس ہو کر پنزیاس نے ایک فون کال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مارکس سے سنیے:۔

"Penzias and wilson were at a loss for any further explanation. This tiny but persistent effect had sabotaged their plan to observe the halo of the galaxy. But just when they were at their wits' end, penzias happend to make a phone call..."

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	400/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	سورہ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بنجر پاکستان میں، باغبانی اور جنگل کاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی'' ہے

☆ 2014ء مری میں باغبانی کی 101 ویں سالگرہ ہے

☆ پاکستان بھر کے باغبانوں، زرعی اداروں، زرعی یونیورسٹیوں اور پورے پاکستان کے محکمہ جنگلات اور محکمہ ماحولیات کے دانشور خواتین وحضرات سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ 2014ء کو

''بنجر پاکستان میں باغبانی اور جنگل کاری'' کے طور پر منائیں اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔

☆ بنجر پاکستان آباد ہوگا

☆ بنجر پاکستان میں باغبانی ہوگی

☆ بنجر پاکستان میں جنگل کاری ہوگی

☆ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے

☆ غربت کے خاتمہ میں مدد ملے گی

☆ ماحولیات کے لئے یہ سال بطور خاص اہمیت حاصل کرے گا

☆ جہاں مری کے باغبان اپنی 101 ویں سالگرہ منائیں گے وہاں پورے پاکستان کا ساتھ دیتے ہوئے 2014ء کو باغبانی اور جنگل کاری کے طور پر منائیں گے

☆ 100 سالہ پودہ جات میں مری کا آملہ۔ دیسی انار۔ ناکھ ناشپاتی۔ اخروٹ۔ ہاڑی۔ شہتوت۔ بٹنگی۔ پھگواڑی اور ریٹھا کے پودے شامل ہیں۔ لاہور چڑیا گھر کا برگد کا درخت سو سالہ ہے۔ دیگر معلومات درکار ہیں۔

پتہ / رابطہ

(1) ملک حنیف وجدآنی صدر باغبان ایسوسی ایشن سنبل سیّداں نیو مری

(2) صبینہ یاسمین سینئر نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن ٹبی سیّداں سوہاوہ جہلم

(3) تنویر صادق نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن میاں چنوں خانیوال

(4) ڈاکٹر حامد حسین نائب صدر باغبان ایسوسی ایشن بلاک C ڈیرہ غازی خان

(5) طارق ایم ملک شعبۂ نشتر واشاعت باغبان ایسوسی ایشن چارہان نیو مری

(6) احمد نواز خان تاحیات ممبر باغبان ایسوسی ایشن گاؤں گھماواں نوانشہر ایبٹ آباد

پرویز صاحب کی برسی کے حوالے سے مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی گفتگو

دُنیانیوز چینل کے 24 فروری 2014ء کے ''نقطہ نظر'' پروگرام میں حبیب اکرم صاحب اور مجیب الرحمان شامی صاحب نے پرویز صاحب کی برسی کے حوالے سے ان کی شخصیت اوران کے نظریات پر مختصر تبصرہ کیا جس کی تفصیل ذیل میں بلاتبصرہ پیش کی جارہی ہے۔

حبیب اکرم صاحب نے کہا کہ

''شامی صاحب اگلا جو موضوع ہے وہ ہے غلام احمد پرویز صاحب (اور یہ very close to my heart موضوع ہے''۔

مجیب الرحمان شامی صاحب نے کہا کہ

''آج پرویز صاحب کی اٹھائیسویں برسی منائی جارہی ہے۔ میں 1964ء میں ساہیوال گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ یونین کا صدر تھا۔ میں نے اس وقت ان کو لیکچر دینے کے لئے (پرویز صاحب) کو بلایا تھا مجھے ان کے نظریات سے اختلاف رہا لیکن ایک ذی علم آدمی کے طور پر میں ان کی عزت کرتا تھا میں نے ان کا جنازہ بھی پڑھا۔ لیکن وہ سنت کے کچھ معاملے میں تھوڑا سا بھٹکے۔ وہ کہتے تھے سنت اتھارٹی نہیں قرآن اتھارٹی ہے۔ اب یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ انہوں نے کچھ غیر محتاط الفاظ استعمال کر لیے کچھ ان کی بات سمجھی نہ گئی یا وہ سمجھا نہ سکے یہ بڑی پیچیدہ بحث ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ جو ریاست ہے جب اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے اسلامی حکومت یا خلیفۂ مسلمین کے جو اختیارات ہیں اجتہادات کے، وہ بہت ہوتے ہیں۔ اور وہ پرانے اجتہادات کے مقابلے میں بھی نئے اجتہادات کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو سمجھا گیا کہ یہ منکر سنت ہیں وہ اس کو بائنڈنگ نہیں سمجھتے۔ ہمارا پروگرام اس کا متحمل نہیں ہے بہرحال میری ان سے ملاقات ہوئی انہوں نے بڑی اچھی کتابیں لکھیں۔ حضرت عمرؓ کی سیرت ''شہکارِ رسالت'' وہ تو کمال کتاب ہے اور سچی بات یہ ہے کہ وہ تو سونے میں تولنے کے قابل ہے۔

اینکر پرسن حبیب اکرم صاحب نے پھر سوال کیا کہ وہ شخصی اعتبار سے کیسے آدمی تھے۔

شامی صاحب جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''شخصی اعتبار سے مرنجاں مرنج آدمی تھے ہنستے بولتے تھے میرے ساتھ ان کی بڑی بحث ہوتی تھی یہاں ان کے مرید تھے چوہدری منیر نیشنل بنک کے ریجنل چیف جب بہار کا موسم آتا وہ چائے پلاتے تھے۔ مجید نظامی صاحب، زیڈ اے سلہری صاحب، میم شین صاحب، ممتاز احمد خاں صاحب اور میں، بڑی بحث ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ بحثیں، ان کے جو نظریات تھے ان سے مجھے بہت اختلاف تھا لیکن عزت ذی علم لوگوں کی عزت کرنی چاہئے''۔

اگر آپ اس پروگرام کے اس حصے کی ویڈیو دیکھنا چاہتے ہیں تو دُنیانیوز چینل کی ویب سائٹ پر 24 فروری کے پروگرام ''نقطہ نظر'' یا arshad1970@facebook.com پر request بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

وراثت کتاب کے تقاضے اور اس کی ذمہ داریاں

قرآن کریم کا ارشاد عالی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں رسول مبعوث فرمائے ہیں (4:164) اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن سب کی نبوت پر ایمان لائیں۔ اور یہ تسلیم کریں کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ہر مذہب کے بانی کا دل سے احترام کریں۔ قرآنِ کریم نے تمام انبیاء کرام کا ذکر قرآن میں نہیں کیا۔ قرآن میں صرف ان انبیاء کرام کے نام آئے ہیں جن سے قرآن کے مخاطب واقف تھے۔ ان انبیاء کرام کا نام لینا جن سے اس وقت کے عرب واقف ہی نہیں تھے، بات کو مزید اُلجھا دینے کا سبب بنتا۔ انبیاء کرام کی بعثت کا سبب قرآن نے یہ بتایا ہے کہ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (4:165) یہ تمام رسول اس لئے مبعوث کئے گئے تھے تا کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں صحیح راستہ تو بتایا نہیں تھا۔ عقلاً بھی یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ اپنی ہدایات کسی قوم کو نہ دے دے، اس پر گرفت کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ ہر قوم سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ہماری طرف سے کوئی تنبیہہ کرنے والا نہیں آیا تھا۔ تو وہ بھی یہی جواب دینگے کہ ہاں ہمارے پاس ایک ڈرانے والا آیا تھا، لیکن ہم نے اس کی تکذیب کی تھی۔ قَالُوا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا (67:9)۔ (ترجمہ) انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس ایک نذیر آیا، لیکن ہم نے اس کی تکذیب کی۔ اگر کسی قوم تک وحی الٰہی کی تعلیم ہی نہیں پہنچتی، تو اس کی غلط روش پر اس قوم کی گرفت نہیں کی جاسکتی۔ ختم نبوت بعد کے انبیاء کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا اور یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ٹھہری کہ وہ ساری دنیا میں اس قندیل نورانی کو لے کر پھریں اور اِس کی روشنی سے سارے جہاں کو منور کریں۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122)۔ (ترجمہ) وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اِس کے لئے ایک نور (قرآن) قرار دیا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ کیا اس شخص کی مانند ہوسکتا ہے جو کہ تاریکیوں میں ہو اور اس کے باہر نہ نکل سکے۔ اس شخص یا قوم کا تاریکیوں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ ہم اس کے پاس قرآن کریم کی روشنی لے کر جاتے اِس قوم کو اس بات سے آگاہ کرتے کہ صرف قرآن کا عطا کردہ نظام ہی انسانیت کے مسائل حل کرسکتا ہے۔ ساری انسانیت خواہ جتنے جتن کر دیکھے، انسانیت کی فلاح کسی دوسرے راستہ پر ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم نے چونکہ قرآن کی یہ تعلیم ان اقوام عالم تک نہیں پہنچائی اور قرآنِ

کریم کے نظام کی برکات سے اُنہیں آگاہ نہیں کیا تو اس کا یہ نتیجہ نکلا جو اِس سے اگلی آیت میں بیان فرمایا گیا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (6:123)۔ (ترجمہ) (قرآن کی روشنی نہ پہنچنے کی وجہ سے) ہم نے اسی طرح سے ہر ہر شہر اور ہر ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں۔ اور وہ مکر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو ہی دھوکا دیتے ہیں۔ قرآن کریم نے انسانوں کے وضع کردہ نظام کے اربابِ حل وعقد کو ''اکبر مجرمین'' کہہ کر پکارا ہے قرآن کی رو سے غیر اسلامی نظام میں بسنے والا ہر شہری مجرم' فاسق وظالم ہوتا ہے (5:45, 5:47)' لیکن اس کے لیڈر ''اکبر مجرمین'' یعنی مجرموں کے سردار ہوتے ہیں۔ آج ساری دنیا کی حکومتیں اور اس کے شہری اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ اور اِس کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ان کو اسلامی نظام سے متعارف ہی نہیں کرایا۔ جو ہماری سب سے بڑی ذمہ داری تھی' اور آج بھی ہے۔

حضور ﷺ نے اپنے دورِ مبارک میں اسلامی نظام قائم فرمایا۔ حضور ﷺ کی مملکت دس لاکھ مربع میل پر وسیع تھی۔ اس نظام کا قائم کرنا حضور پر فرض تھا۔ اس کے قائم کرنے میں حضور نے اپنے فرائض سے تجاوز نہیں کیا۔ بلکہ قرآن کی تعلیم پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ حضور نے یہ نظام وقتی یا ہنگامی طور پر قائم نہیں فرمایا تھا اس نظام کا حضور کی ذات مبارکہ تک ہی انحصار نہیں تھا' بلکہ اس نظام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہنا تھا۔ اِس نظام کو قائم رکھنا وراثت کتاب کا لازمی تقاضہ تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (3:144)۔ (ترجمہ) محمدؐ تو بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیئے جائیں' تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ یعنی جس طرح دنیا میں اور رسول گذرے ہیں اسی طرح حضور بھی ان رسولوں میں سے ایک رسول تھے، جس طرح تبلیغ دین اور اقامتِ دین میں دوسرے رسولوں کو دقتیں اور مصیبتیں پیش آئیں' اسی طرح یہ مصیبتیں ان کو بھی پیش آئیں۔ یہ تمام رسول اِس سے پیشتر فوت ہوئے' رسول ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اُنہیں موت نہیں آئے گی۔ لیکن ان رسولوں کی وفات یا حضور کی وفات کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تعلیم کو ترک کر دیں اور جو نظام انہوں نے ایک مرتبہ قائم فرما دیا' اس کو لپیٹ کے رکھ دیں' ہرگز ہرگز نہیں۔ یہ نظام قیام قیامت تک کے لئے جاری رہنا ہے اور جس قوم کو اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اس نظام کو جاری رکھے۔ اِس نظام کو جاری رکھنا اس لئے بھی ضروری تھا' اور اس وقت بھی ہے کہ اِس نظام کی اطاعت سے ہی اطاعت خدا اور رسول ہوتی ہے۔ یعنی قرآن کی اطاعت اسلامی نظام کے توسط سے۔ اگر اسلامی نظام منقرض ہو جائے جیسا کہ اِس وقت ہے' تو اللہ ورسول کی اطاعت کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو وارث کتاب قرار دیا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (35:32)۔ پھر ہم نے وارث کیا' کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے چن لیا اپنے بندوں میں سے۔ اس ملت کی اہمیت کا اندازہ آپ لفظ اصطفنا سے

لگائیں۔ یہ وہی لفظ ہے جس سے حضورؐ کو مصطفیٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اس ملت کے ہر شخص کو مصطفےٰ قرار دیا ہے۔ وارثِ کتاب کا فرض ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم اور اس کی ہدایات کو ساری دنیا تک پہنچائے۔ قرآن نے اسے امت أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کہا ہے (2:143) تم ایسی امت ہو کہ تم ساری دنیا میں لوگوں کی نگرانی کرو دوسری اقوام کی نگرانی وہ ہی قوم کر سکتی ہے جس میں اتنی قوت ہو کہ وہ دوسروں کو حکم دے سکے۔ جو قوم خود دوسروں کی دست نگر ہوگی' وہ دوسری قوتوں کی نگرانی کس طرح کر سکتی ہے۔

وراثت کتاب کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ جو نظام حضور نے قائم فرمایا تھا اِس نظام کو جاری رکھا جائے۔ اور یہ نظام ساری دنیا کی منفعت کے لئے قائم کیا جاتا ہے اِس نظام کے قیام میں تمام انسانیت کی فلاح و بہبود پیش نگاہ ہوتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے ذاتی مفادات ہوتے ہیں وہ اس نظام کے قیام میں سخت مخالفت کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے جب مدینہ میں یہ نظام قائم فرمایا تھا تو قرآن نے اِس بات کی بخوبی وضاحت کر دی ہے کہ اس وقت مخالفت حضور کی ذاتی نہیں تھی بلکہ مخالفت اِس نظام کے قیام کی تھی۔ کیونکہ اس نظام سے اِس دور کے ذاتی مفادات کے حاملین' یعنی قریش کے مفادات پر بڑی سخت ضرب پڑتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (6:33)۔ (ترجمہ) سو وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے' لیکن یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی وہ حضور کی ذاتی مخالفت نہیں کر رہے تھے بلکہ اس نظام کے قیام کے مخالف تھے۔ یاد رکھئے جب بھی اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کی جائے گی' اسی طرح اس کے قیام کی مخالفت ہوگی جس طرح ہر مخالفت حضور کے دور میں ہوتی تھی۔

امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا میں اسلامی نظام کا علمی و عقلی حیثیت سے تعارف کرائے۔ ارشاد ہوتا ہے هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12:108)۔ (ترجمہ) (حضور نے فرمایا) میرا راستہ تو یہی ہے کہ میں اللہ کی طرف دلائل و براہین کے ساتھ بلاتا ہوں اور جو لوگ میرا اتباع کرتے ہیں وہ بھی دلائل کے ساتھ بلاتے ہیں ایک دوسرے مقام پر قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي (3:31) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ ہمارے علماء کرام اس آیت سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ ہمیں وہ معاشرت اور طرز زندگی اختیار کرنا چاہئے جو رسول نے اختیار فرمایا تھا۔ ان کی طرح کا لباس پہنیں۔ ان کی طرح کے ہی کھانے کھائیں۔ ان کی طرح مسواک کریں اور ان کے دن بھر کے معمولات کی پیروی کریں۔ جو کتب احادیث میں درج ہیں۔ لیکن غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ احادیث تو اڑھائی سو سال بعد جمع ہوئی ہیں۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اس وقت تو یہ صورت حال ہو ہی نہیں سکتی۔ اِس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ جس طرح میں اللہ سے محبت کرتا ہوں تم بھی میرا اتباع کرتے ہوتے اللہ سے محبت کرو اور جس طرح میں نے ہزاروں کوششیں کر کے اسلامی نظام قائم کیا ہے تم بھی ایسا کرو۔ لیکن اس آیت کے ذیل میں تفسیر ضیاء القرآن میں مرقوم ہے اس کی تعمیل کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم حضور کے افعال کو بالکل

اسی طرح ادا کریں جیسے حضور نے ادا فرمائے تھے اور صرف اس لئے ادا کریں کہ یہ افعال اس ذات اطہر واقدس سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ جو جمال وکمال کا وہ پیکر ہے جس سے حسین تر اور جمیل تر چیز کا تصور تک ممکن نہیں''۔ ص333۔ پھر ان علماء کرام کی تانت یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ حضورؐ کی زندگی کے اعمال وافعال پر صرف اسی صورت ہی عمل ہوسکتا ہے جب آپ حدیث کو حجت قرار دیں اسے وحی خفی شمار کر کے اس کو قانون کا ماخذ تسلیم کریں۔ لیکن علماء کرام کا یہ موقف درست نہیں ہے قرآن نے اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر خود سورۃ یوسف کی محولہ بالا آیت میں پیش کر دی ہے جس میں حضور نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ کی طرف دلائل کے ساتھ بلاتا ہوں اور یہی میرا اتباع ہے۔ آپ اس بات پر غور فرمالیں کہ قرآن کے تجویز کردہ اتباع رسول کے اِس طریقہ کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے حضورؐ کی دانش وبینش اور علمی دلائل سے ہم کس طرح محروم ہوگئے ہیں۔ حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں تقریباً پانچ خطبات جمعہ ارشاد فرمائے ہیں۔ ان خطبات میں سے شاید چند سطور محفوظ ہوں ورنہ ان خطبات کا کوئی حصہ محفوظ نہیں۔ سورہ یوسف کی اسی آیت سے خوب واضح ہو رہا ہے کہ حضور دلائل کیساتھ دین کی دعوت پیش فرماتے تھے' لیکن ان دلائل میں سے کوئی دلیل ہمارے اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور کے پیش کردہ دلائل سے مضبوط اور کس کے دلائل ہوسکتے ہیں۔ وہ دلائل اگر موجود ہوتے' تو اس دور میں وہ سب سے زیادہ کام آتے۔

ہماری تاریخ میں مباہلہ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ 24 ذی الحجہ کو یہ واقعہ وجود پذیر ہوا کہ بنی نجران کے عیسائی علماء حضور کے پاس آئے اور تین روز تک ان کی بحث حضورؐ سے جاری رہی جس میں حضورؐ نے توحید باری تعالیٰ اور اپنی نبوت کے ثبوت ان کو دیئے۔ وہ علماء بالکل متاثر نہیں ہوئے اور یہ بحث بغیر کسی فیصلے کے ختم ہوگئی۔ اس پر علماء بنی نجران نے حضورؐ کو مباہلہ کا چیلنج دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ علماء بنی نجران اپنے عزیزوں کے ساتھ' اور حضورؐ اپنے عزیزوں کے ساتھ ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے کے خلاف یہ دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس فیصلے کے بعد اگلے روز حضورؐ حضرت علیؓ' حضرت فاطمہ الزاہراؓ اور حضرت حسنین کو ساتھ لے کر موقع پر پہنچ گئے۔ علماء بنی نجران نے جب ان ذواتِ مقدسہ کو دیکھا تو انہوں نے وہ مباہلہ منسوخ کر دیا۔ ان کو خیال ہوا کہ ایسی مقدس' نورانی ہستیاں ہیں کہ وہ ان کی بددعا کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ حواشی عثمانی میں آیت نمبر 3:61 کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ علماء بنی نجران ''حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حضرت حسنؓ' حسین حضرت فاطمہؓ' علی رضی اللہ عنھم کو ساتھ لے کر باہر تشریف لا رہے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے۔ ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو' ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہیں رہے گا آخر انہوں نے مباہلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کر لیا' اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔ اگر آپ خواہشمند ہوں تو اس واقعہ کی مزید تفصیلات اسی آیہ مباہلہ 3:61 کے ذیل میں

تفاسیر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں، لیکن جو دلائل حضور ﷺ نے تین روز مسلسل ان کے سامنے پیش کئے ان دلائل میں سے ایک دلیل بھی آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ دوسری غور کرنے کی یہ بات ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ وان حضرات کے نورانی چہروں سے اِس درجہ متاثر ہوئے اوران کی بددعا سے خوف زدہ ہوگئے، تو پھر اُنہیں ایمان لانے میں کیا چیز مانع تھی کہ وہ صلح کر کے واپس چلے گئے۔ حضورؐ کے وہ دلائل موتیوں سے زیادہ چمکدار اور قیمتی ہوتے۔ لیکن ہمارے مفسرین نے تو علمی رُخ اختیار ہی نہیں کیا۔ وہ حضورؐ کے ذاتی افعال واعمال کو ہی جمع کرتے رہے۔

چونکہ ہمارا سارا لٹریچر مذہبی نقطہ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس لٹریچر میں نظام عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ آیات جو براہِ راست نظام کی داعی ہیں، اُنہیں بھی قیامت کے دن سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ سارا زور پرستش پر ہے۔

☆.....☆.....☆

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

کے سلسلۃ الذھب کی اگلی زرّیں کڑی جو کہ سورہ الفتح، سورہ الحجرات، سورہ قٓ، سورہ الذاریات، سورہ الطّور، سورہ النجم پر غلام احمد پرویز صاحب کے دروس القرآن پر مشتمل ہے۔ اِس جلد کی ضخامت 550 صفحات اور قیمت صرف 500 روپے ہے۔ اِدارہ سے دستیاب ہے۔

ایک نکتہ

بنجر پاکستان میں باغبانی، جنگل کاری اور آباد کاری کے لئے تمام بے کار افرادی قوت کا صحیح استعمال ہی ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ کوئی ہے جو یہ حل کر دے!

(باغبان ایسوسی ایشن)

مقصودِ اقبالؒ

اسد ملتانی

یہ اشعار مجلس مرکزیہ یوم اقبالؒ لاہور کے منعقد کردہ ''یوم اقبال'' مورخہ 10 اپریل 1939ء کے لئے لکھے گئے۔ یہ محض تخیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے واقعہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کہا اقبالؒ سے اک ہمنشیں نے — سخن تیرا شرابِ آتشیں ہے
کچھ اس انداز سے گرما دیے دِل — کہ اب تسکین ممکن ہی نہیں ہے
حرارت ہے ترے سوزِ نوا کی — کہ بجلی سی دلوں میں جاگزیں ہے
کلامِ شاعراں پروردۂ عصر — مگر تیرا سخن عصر آفریں ہے
اثر میں ہے یہ صُورِ محشر انگیز — کشش میں نغمۂ خُلد بریں ہے
بدل ڈالا مذاق اس نے ہمارا — دل اب طرزِ کہن پر نکتہ چیں ہے

ترے اشعار پڑھ کر اب نظر میں
کسی کی شاعری جچتی نہیں ہے

یہ سُن کر حضرتِ اقبالؒ بولے — فقط لطفِ سخن کافی نہیں ہے
زمینِ شعر ہی میں گم نہ ہو جا — فلک وہ ڈھونڈ جس کی یہ زمیں ہے
مرے فکرِ فلک پیما کی پرواز — ادب پروردۂ روحُ الامیں ہے
فروغِ عشق و سوزِ آرزو سے — سخن میرا تب و تاب آفریں ہے
مگر میرے سخن کی روشنی بھی — ''چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے''
میرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا — اگر تو سالکِ راہِ یقیں ہے
تری نظروں میں ہیں میری تصانیف — مری نظروں میں قرآنِ مُبین ہے
گذر جانا مری بزم سخن سے — رہِ قرآں میں گامِ اولیں ہے
جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے — تو حاصلِ دولتِ دنیا و دیں ہے

محیطِ کائناتِ دل ہے قرآں
نظر کی آخری منزل ہے قرآں

عطاء الحق قاسمی

ویلنٹائن ڈے، بسنت، نیوائیر اور دیگر لہو ولعب

اللہ جانے یہ ویلنٹائن ڈے کیا بلا ہے جس کے حق میں اور جس کے خلاف یار لوگ ایک دوسرے کو لتاڑنے اور پچھاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ سنا ہے یہ دن ایک دوسرے سے محبت کے اظہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ دوست احباب اور عاشق و محبوب ایک دوسرے کو پھول بھیجتے ہیں لیکن ان پھول بھیجنے والوں کے علاوہ سنگ زنی کرنے والے بھی تو بہت ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ اس تہوار کی مخالفت کی وجہ اس کا امپورٹڈ ہونا ہے لیکن امپورٹڈ چیزیں تو وہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں جو اس ''امپورٹ'' کے مخالف ہیں۔ یہ پرفیوم، یہ ٹی وی، یہ کار، یہ جہاز، یہ اے سی، یہ فریج غرضیکہ ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جو ہماری اپنی ہے لیکن جو لوگ خصوصی طور پر ویلنٹائن ڈے کے خلاف ہیں تو وہ یونہی تو اس کے خلاف نہیں ہوں گے آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ سر سے پاؤں تک امپورٹڈ ہونے کے باوجود یہ امپورٹڈ تہوار انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ ان سے بات کر کے دیکھ لی جائے ممکن ہے وہی صحیح ہوں باقی غلط ہوں۔

چنانچہ میں نے ایک دوست کو جو کسی طرف سے بھی ''مولوی'' نظر نہیں آتا، کلین شیوڈ ہے، امپورٹڈ سوٹ پہنتا ہے، باہر کا پڑھا ہوا ہے ایک بڑی پوسٹ پر متمکن ہے۔ اس سوال کے لئے موزوں پایا کہ ان تمام امور کے باوجود وہ مذہبی ذہن کا مالک ہے میں نے پوچھا ''یار یہ جو ویلنٹائن ڈے ہے اس میں کیا خرابی ہے؟'' بولا ''اس کی وجہ سے نوجوانوں میں بے راہروی پھیل رہی ہے'' میں نے سوال کیا ''وہ کیسے؟'' بولا ''لڑکے لڑکیاں اس روز اظہار محبت کے لئے ایک دوسرے کو پھول بھیجتے ہیں'' میں نے کہا ''جو لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو اس روز پھول بھیجتے ہیں ان کا افیئر تو اللہ جانے کب کا چل رہا ہوتا ہے تم سارا بوجھ بے چارے ''ویلنٹائن ڈے'' پر تو نہ ڈالو'' کہنے لگا ''اگر ایک بری عادت پرانی ہو جائے تو وہ جائز تو نہیں ہو جاتی'' میں نے عرض کی ''تم صحیح کہتے ہو مگر یہ بتاؤ محبت کرنا بری بات ہے؟'' یہ سن کر وہ خاموش ہو گیا کیونکہ اس کے کم از کم دو افیئرز سے تو میں بھی واقف تھا۔ میں نے اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا اور کہا ''ایک شعر سنو گے؟'' بادل نخواستہ بولا ''سناؤ'' میں نے یہ شعر سنا دیا۔

خلاف شرع تو یوں شیخ تھوکتے بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

اب میں اسے روہانسا کرنے پر تل گیا تھا میں نے کہا ''انگریزوں کو چھوڑو، وہ تو ساری حدیں پار کر گئے ہیں جبکہ ہمارا مشرقی معاشرہ اس محبت و جبت کی غلاظت سے ہمیشہ دور رہا ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' یہ سن کر میرا یہ دوست بہت خوش ہوا اور بولا ''اب تم نے صحیح بات کی ہے، یہ سب لعنت ویلنٹائن ڈے سے شروع ہوئی ہے'' میں نے کہا ''میں نے صحیح بات نہیں کی، بونگی ماری ہے۔ یہ لیلیٰ مجنوں، یہ شیریں فرہاد، یہ مرزا صاحباں اور اس طرح کے دوسرے بہت سے رومانی کردار امریکی تھے کہ برطانوی تھے؟ اور یہ مرزا صاحباں جو کچھ کرتے رہے ہیں تم سے زیادہ اس سے کون واقف ہوگا'' یہ سن کر وہ ایک دفعہ پھر چپ ہو گیا، جس کے نتیجے میں میری زباں درازی

بڑھتی چلی گئی' میں نے کہا ''یہ ہماری ساری اُردو اور فارسی شاعری' یہ ہماری رومانی لوک شاعری جو ہماری لڑکیاں ڈھولک پر گاتی ہیں' یہ سب ویلنٹائن ڈے کی دین ہیں؟'' اس پر وہ زچ ہو گیا اور بولا ''بک بک بند کرو' کسی اور موضوع پر بات کرتے ہیں!''۔

میں خود بھی اس موضوع سے اکتا گیا تھا چنانچہ میں بولا ''ٹھیک ہے' اب تم یہ بتاؤ ہمیں بسنت کا تہوار منانا چاہئے؟'' کہنے لگا ''ہرگز نہیں'' میں نے پوچھا ''کیوں؟'' بولا ''یہ ہندوؤں کا تہوار ہے'' میں نے جواب دیا ''یہ ہندوؤں کا تہوار نہیں موسمی تہوار ہے۔ تم نے سنا نہیں' آئی بسنت پالا اڑنت اور بالغرض اگر یہ ہندوؤں کا تہوار بھی ہے تو ہماری بہت سی مذہبی رسومات جنہیں باقاعدہ مذہب کا درجہ دے دیا گیا ہے وہ بھی ہندوؤں کے ساتھ کئی صدیاں اکٹھے گزارنے کے نتیجے میں وجود میں آئی ہیں''۔ اس پر میرا دوست پھر خاموش ہو گیا' مگر اس کی یہ خاموشی دیرپا نہیں تھی' اس نے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا اور ایک سگریٹ کو ہلکا سا پانی میں ڈبو کر اس کا کش لیتے ہوئے بولا ''میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ہم سچے مسلمان ہیں تو ہمارا ہر عمل اسلام کے مطابق ہونا چاہئے'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''گویا اجازت ہے کہ میں تمہارے نقش قدم پر چلنا شروع کر دوں'' اس پر وہ کچھ گڑبڑا سا گیا اور بولا ''میں تو ایک گنہگار مسلمان ہوں' تم نے اگر کسی کی پیروی کرنی ہے تو کسی اچھے مسلمان کی کرو'' میں ہنستے ہوئے بولا ''اس کنفیشن کا شکریہ' تم یہ بتاؤ کہ ویلنٹائن ڈے' نیوائیر کی تقریبات' بسنت اور اس طرح کی دوسری خرافات سے بچنے کے بعد ایک سچا مسلمان اگر اپنے فارغ وقت میں کسی تفریح سے دل بہلانا چاہے تو کیا کرے؟'' بولا ''بھئی سچی بات ہے کہ جس طرح کی تفریحات تم چاہتے ہو اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا' اسلام میں فوٹو گرافی حرام ہے' موسیقی حرام ہے' مصوری حرام ہے' شطرنج حرام ہے' عشق و عاشقی والی شاعری حرام ہے' لطیفہ گوئی حرام ہے کہ اس میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے چنانچہ اس طرح کے لہو ولعب کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام صرف صالح تفریحات کی اجازت دیتا ہے''۔ میں نے پوچھا ''مثلاً'' بولا ''عیدین کے تہوار ہیں' اس روز مسلمان صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں' اچھے کھانے کھاتے ہیں' ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں'' میں نے کہا ''جن کے پاس چار پیسے ہیں' وہ یہ کام تو روزانہ کر سکتے ہیں' ویسے بھی کپڑے اور کھانا کب سے تفریح میں شامل ہو گیا ہے' یہ تو انسان کی بنیادی ضروریات ہیں'' میرے دوست نے میری یہ بات سنی تو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا ''یار سچی بات یہ ہے کہ تمہیں یہ سوال کسی عالم دین سے کرنا چاہئے' دینی معاملات بہت نازک ہوتے ہیں میں اللہ جانے کیا جواب دوں اور یوں خواہ مخواہ گنہگار ٹھہروں''۔

مجھے اپنے دوست کی یہ بات اچھی لگی کہ ہم بے علم لوگ آپس میں ٹامک ٹوئیاں کیوں ماریں چنانچہ اب میں یہ سوال کسی عالم دین کے سامنے رکھوں گا تاکہ وہ ان تمام ذہنوں کی تشفی کر سکیں جن میں یہ سوال کلبلاتے رہتے ہیں! اسلام دین فطرت ہے چنانچہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان کی فطری خواہشات کی تسکین کا کوئی نظام ہی اس میں موجود نہ ہو یہی وجہ ہے کہ میں نے بعض ''جید'' علماء سے سنا ہے کہ جو تفریح انسان کو یادِ الٰہی سے غافل کر دے وہ حرام ہے۔

(روزنامہ جنگ لاہور)

☆.....☆.....☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

Surah *Al-Qiyamah* (القيامة) – Durus-al-Qur'an Parah 29: Chapter 23

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends! Today is March 9, 1984 and today's lecture starts with Surah *Al-Qiyamah* (القيامة) (75:1).

Last stage in the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل)

Dear friends! If you remember the confrontation between the Quresh and the Prophet (PBUH) had been going on for 22-23 years and was reaching its final stage. The Quran now presents this last confrontation, this last fight in this continued struggle. As a matter of fact, the confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) has been going on since the beginning of time: Adam and the devil Iblis came on the stage at the same time; and Iblis asked for and was granted respite until the last the day. This means that this confrontation between the Prophet (PBUH) and the Quresh was taking on an unparalleled epic event in the annals of history. It was now entering the last stage of this conflict. This chapter begins from here.

Dear friends! In the previous chapters you saw that the Prophet (PBUH) was told to raise a party of committed companions: He was told to rise up "**قُمْ** (74:2)" to bring new life to the degraded and deprecated human universe. He was told to bring a revolution. The real force behind this revolution was this "**قُمْ** (74:2)" or "rising-up". This "rising-up" does not mean here to rise up from a sitting position. This "rising-up" is for a goal and purpose that continues in this chapter: لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (75:1) — I do call to witness the day of الْقِيَامَةِ; I present the event of الْقِيَامَةِ as witness. You know that قُمْ and قِيَامَ have the same root. When the letter "ۃ" comes after قِيَامَ then it means "something happening suddenly and with intensity". So, الْقِيَامَةِ is essentially قِيَامَ but not gradual but sudden: something which had been going gradually but a stage is reached in this gradual process that an event happens suddenly and comes to the fore. *This* is called الْقِيَامَةِ. And, when "الْ" comes in front of a word in Arabic then it means the definite article "*the*" in English. Therefore, الْقِيَامَةِ means a definite event that will happen suddenly and with high intensity. I had mentioned that Quranic terms where there is mention of such events then these apply to this world as well. These events

are applicable to this world's hell and heaven as well, not just to the hell and heaven of the Hereafter which, of course, will occur as part of our Iman (ایمان). The confrontation between Truth (حق) and Falsehood (باطل) goes on gradually but a stage comes in which the speed and intensity of this confrontation shoots up suddenly. This is referred to as الْقِيَامَةِ by the Quran.

Let me mention one important thing here: This term الْقِيَامَةِ in the Quran has come at many places and in many Surahs. What meaning is to be taken – whether it is the rising-up for creating a revolution that occurred at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions in this world or whether it is the resurrection of the dead in the Hereafter – is based on what the Quran calls "يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (47:24)" or pondering in the Quran. By the process of " يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ " if someone takes the meaning of الْقِيَامَةِ as the rising-up for creating a revolution that occurred at the hands of the Prophet (PBUH) and his companions in this world, then this does not have any effect on his Iman or faith. And, also, we should note that that revolution of the Truth vs. Falsehood has not ended; but it continues till today and will continue until the last day. This order of قُمْ and قِيَامَ equally applies to as it did to the Prophet (PBUH) and his companions. And this order remains applicable to all nations until the Day of Judgment. But this order is *especially* applicable to this Ummah who is the inheritor of the Book, in the words of the Quran. There is الْقِيَامَةِ at every step for this Ummah, in fact. This is extremely important to keep in mind.

A lifeless nation cannot even comprehend the meaning of قُمْ or الْقِيَامَةِ

My dear friends! In fact, there is الْقِيَامَةِ hidden in every human breath, if one cares to ponder about it. This الْقِيَامَةِ occurs in every period, provided the Ummah is alive to notice it. There is no "rising-up" or قِيَامَ for a dead nation. A dead nation cannot even comprehend the meaning of "rising-up" or قِيَامَ, let alone implement it. If this Ummah, the inheritor of the Book, were to become alive then only it will find out what this الْقِيَامَةِ is? I had just mentioned that this is a matter of " يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (47:24)" i.e., what meaning is appropriate in a particular place of the Quran for الْقِيَامَةِ: whether it is rising-up for revolution in this world or whether it is rising up or resurrection in the Hereafter; provided of course that it is not against the basic teachings of the Quran. This is not a matter to argue, to fight, to attach derogatory labels, or to pass fatwa of Kufr.

Our fatwas of Kufr

But our situation has deteriorated so much and has gone so bad that now fatwas are issued about whether the word "Amen" is to be recited loudly or silently. How then to expect "يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (47:24)" from such people? This is something far beyond the mental aptitude of these people –although Allah has kept this process of يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ open until the Day of Judgment. It is not only that this is allowed but that it is a mandatory *order* of Allah to the nation – that calls itself the inheritor of this Book – to do يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ . So, this should be the case in every period. We are *required* to do يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ today.

The يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ done in the past cannot remain authority for future generation forever

My dear friends! The pondering (تَدَبَّر) in the Quran done any period or of any person cannot serve as authority for future generations. They cannot be told that they *have* to follow it; that they must take it as such as it is unchangeable. Only the words (laws) of Allah (كَلِمَاتُ اللّٰہ) are unchangeable. Human thought, human inference and reasoning, human derived meaning of the words of Allah – all these neither could become mandatory for others nor could they remain unchangeable for all time. Otherwise, this order of Allah for يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ will end after certain period of time. Unfortunately, for the Muslim Ummah يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ended more than 1000 years ago. If it remained opened who knows how many realities of nature would have been discovered. But we are stuck at the level of thought of 1000 years ago whereas human knowledge has advanced to who knows what level now. What the Quran calls the signs of nature we Muslims have not been able to discover. Allah says in the Quran that We will continue to lift the veil from the face of nature until it becomes manifest that the Quran is *the* reality; that its message is based on *the* reality. Although the veils from the face of nature had been lifting fast in this age of science but we have closed our mind's eyes since 1000 years; and we are told to follow blindly the path laid down for us by our ancestors, the man-made *Shariah*. The door of the تَدَبَّر الْقُرْآنُ was shut more than 1000 years ago. However, before we closed *our* eyes, we had opened the world's eyes. The result? The world has advanced in knowledge and we are terribly left behind in the dark to live on crumbs now; so much so that, no sooner than we try to open our eyes and open door of the تَدَبَّر الْقُرْآنُ than the fatwas of kufr start raining down on us from all directions.

After the Prophet (PBUH) the door of the تَدَبَّر الْقُرْآنُ should have remained open forever. As we mentioned before, according to the Quran, تَدَبَّر الْقُرْآنُ is for *all* human beings for *all* ages. There should no question of fights, debates, arguments, anger, or displeasure about why your inference from تَدَبَّر الْقُرْآنُ is different from mine. This is a matter of thought, understanding, erudition, and elucidation. If there is a difference in our تَدَبَّر الْقُرْآنُ then we should understand that we need to choose the one that is closer to the reality; that is closer to the teaching of the Quran. But that also may not be the last word in the تَدَبَّر الْقُرْآنُ. The last words, in reality, are *the* كَلِمَاتُ اللّٰہِ or the "Words of Allah." Human words can never become the last words. Therefore, we can take both meanings of الْقِيَامَةِ – the revolution in this world or the Day of Judgment of the Hereafter. This is presented as a witness in (75:1). The Quran says: لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (75:1) — I do call to witness the day of الْقِيَامَةِ; I present the event of الْقِيَامَةِ as witness. O Prophet (PBUH)! Tell them it is not like what they think: Do anything what you want and there is no one to hold you accountable. I am presenting the period of الْقِيَامَةِ as a witness when the results of actions will appear:–But nay! I call to witness the accusing voice of man's own conscience! وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (75:2). There is a story mentioned in Surah Yusuf about the wife of Aziz. Here is a verse from this Surah about this نَّفْس اللَّوَّامَةِ (12:53)…Continuing her statement the wife of Aziz said, "I do not absolve myself of blame. I confess my guilt. The baser elements in human beings incline them to do evil. Only those people can be protected from this evil are those who keep in mind Allah's directives given as His *Rahma* (Grace), and most certainly my Sustainer is the protector and dispenser of grace. The law of requital is a reality. The result of human action *does* appear – whether in this world or in the Hereafter.

The latest research on human "Self"

My dear friends! نَّفْس اللَّوَّامَةِ is being presented here as witness. This requires some in-depth analysis. First, the word "نَّفْس" is a very ubiquitous word in the Quran. Although it has many meanings in Arabic language but when it comes in relation to human beings then it is quite strange thing that nothing can be known about it; that what it is? There is no doubt that Western scientists have been doing extensive research about it and it has become a field of knowledge in itself called psychology. They are doing in-depth research in this area. They have come up with different terms like "Soul" or "Psyche" to describe this. As I have mentioned many times before, the Greek philosophers called it "Soul"; and Christianity called it "Spirit". When Western scientists started doing research then they called it "Mind"; and when

they advanced further they called it "Psyche". This is the case in the West and its scientists continue to do their research and in-depth investigation on this. They think there is the physical body of humans which is similar in its function to animals: eating, drinking, procreation, and after certain time it ends. In this there is no human characteristic involved; this is only at the physical level. But there is one thing that is not part of all of the previous evolutionary stages of Life and that is: human freewill.

Human ability and power of freewill

Making a choice is part of life. The question is: how to choose one among many possible choices. Animals use instinct for this. They are programmed to follow only one way. They do not have to make a choice. A lamb does not have to choose between meat and grass. So does a lion. It is not possible for a lion to eat grape instead of meat even for his survival. Only humans have been granted freewill and the ability to choose. For this it becomes necessary to decide what way among the many ways to choose using one's freewill. This is an attribute of God and granted exclusively to humans only.

The meaning of رُوحَ

My dear friends! The Quran has said that human beings were granted a gift of Allah's رُوحَ. The root meaning of رُوحَ is divine energy that gives the power of choice. This is a great power: the power to choose, the power of freewill. The Quran calls it نَفْس. This is neither the part nor the product of physical body. Therefore it is not subject to physical laws. It decides; it intends; it prepares the physical body for action, it provides willpower; and it is responsible for its decision. It is this entity that bears the entire responsibility of any action and the Quran has termed it نَفْس. It cannot be translated. I just mentioned that in the English language several words have been coined for this and subsequently been discarded but still no conclusive term or word has been found to describe this power, this supra-physical energy.

What is this "I"?

Dear friends! The Quran calls it نَفْس. The question: "What it is?" – Let us leave this for a moment. Just think when you say "I did this" then can you tell what this "I" is that did this. Leave aside the intellectual arguments. The truth is we have stopped "thinking". Otherwise, if we could think then there was no need to get into

intellectual arguments. What is this "I"? If your hand stole something, then this hand is not the "I". You do not say that my hand has done this, not "I". There is no need to get into intellectual arguments; when you say "I did this" then it is this "I" that is the نَفْس. That is it. This is not the physical body, not the hand, not the feet, not the eye, not the ear. These are not the نَفْس but they are also not separate from it. Someone decided to steal – for this he stretched his hand; the hand got into the pocket and grabbed the thing and stole it; the feet ran fast. All these things are correct. They are the machinery, the tools, the means to carry out the decision taken by the نَفْس; then the responsibility lies on this نَفْس which decided to steal in the first place; and *it* used all the others in carrying out *its* decision. That is why the Quran puts the responsibility for all this on the نَفْس. And the next thing to note is that this نَفْس does not die with the death of the body. It moves on to the next world – carrying its entire baggage of responsibility. If the decisions it made were to do good then it enjoys the results of the delicious fruits of those good deeds; if the decisions it made were to do bad then it suffers the bitten fruits of those bad deeds. The نَفْس never dies. This is its inherent attribute. The animal when it dies then its life ends. For human only the body dies; his "I" never dies. This "I" moves on carrying the baggage of all its responsibilities to the next world.

Different kinds of human نَفْس and their attributes

My dear friends! Let us come to the essence of نَفْس now. There are three kinds that are normally described: 1) نَفْسَ لأَمَّارَةٌ 2) نَفْس اللَّوَّامَةِ and 3) نَفْسُ المُطْمَئِنَّةُ. The Quran describes all three but there are differences between our description and the Quran's. Our normal description of them is that as if these three are separate entities: نَفْسَ لأَمَّارَةٌ directs humans to do evil; نَفْس اللَّوَّامَةِ blames them when they do bad things; and نَفْسُ المُطْمَئِنَّةُ is the one which transcends stress and anxiety and reaches a relaxed state. So, we normally think as if these are three separate نَفْس. This is not the case. All these are expressions and attributes of the same single نَفْس.

What is نَفْسَ لأَمَّارَةٌ

Dear friends! This is worth pondering. نَفْسَ لأَمَّارَةٌ has come in Surah Yusuf in connection with the wife of Aziz who tells: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ (12:53) – "Nor do I absolve my own self (of blame): the (human) soul is certainly prone to evil, unless my Lord bestows His Mercy." This means that it is not the case that نَفْسَ لأَمَّارَةٌ always incites human beings to do evil. Here the Quran has refuted the

belief of Christianity that every child is born in sin. The Quran says that human's نَفْسَ لأَمَّارَةٌ leads also towards evil but, on whom Allah's mercy is bestowed, they are not prone to do evil. So, basically it is not that نَفْسَ لأَمَّارَةٌ leads to evil. But only those not under the mercy of Allah are the ones directed by نَفْسَ لأَمَّارَةٌ towards evil. I will get into more details later. But note my dear friends! The Quran describes such basic realities in few words to counter false beliefs such as the fundamental belief of Christianity that each child is born in sin. The Quran refutes this in just few words. Amazing!

I will come to نَّفْس اللَّوَّامَةِ later. But let us discuss نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ.

What is نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ?

The third stage of نَّفْسُ is نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ. These are terms of the Quran my friends! If we come to the root meanings of terms then we get into a rapturous frame of mind. It is this نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ that humans need to qualify for in order to go to heaven:

(To the righteous soul will be said:) "O (thou) soul, in (complete) rest and satisfaction! "Come back thou to thy Sustainer,- well pleased (thyself), and well-pleasing unto Him! "Enter thou, then, among My devotees! "Yea, enter thou My Heaven! (89:27-30) يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ; ارْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ; فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ; وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ

This is نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ – this is the balanced mind. This is the stage where there is no anxiety, there is no doubt; there is no stress or strain. It is complete and at peace with itself; it has made all the right decisions; it has acquired the passing qualification; and thus it has qualified itself to go to heaven. The Quran has given this certificate of نَّفْسُ المُطْمَئِنَّةٌ for successfully completing the life's examination.

Whether it is heaven or it is hell – only *groups* will enter

Dear friends! This is the Quran. Whatever it says it always brings its real goal into focus. Here also it has brought its central goal: Going to heaven or hell is not an individual affair; this is a matter of groups. What you call salvation is not of individuals according to the Quran. This is not spiritualism that only that person will taste who will drink it. This is the Quran my friends! This is not Monasticism; this is not Christianity; this is not Mysticism. This is to go to Jannah. The Quran says regarding this: فَادْخُلِي فِي عِبَادِي. One will enter Jannah with others.

Dear friends! The Quran always brings into focus its basic teaching no matter what issues are being discussed. Here the Quran said that نَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ is individual; it is unique to everyone but it also emphasizes that its salvation does not occur individually. Other religions emphasize individual purification and individual salvation for the hereafter. But the Quran emphasizes that neither its purification nor its salvation occurs individually in isolation but that it occurs only through a group that believes in the common goal of universal nourishment. Individuals do not go to heaven or hell but they go in groups according to the Quran. Who does not feel the kind of hell the whole world is in now, especially the hell we Muslims are in? Instead of going to heaven one by one individually, we Muslims, as a nation, are living in collective hell today. If someone living in this collective hell wants to go to heaven as an individual, then it is impossible. The whole group will have to be either in heaven or in hell: فَادْخُلِي فِي عِبَادِي. – One will have to enter Jannah in company of others.

نَّفْس اللَّوَّامَةِ and the human conscience

Let us come to نَّفْس اللَّوَّامَةِ now; which means the نَّفْس that censures or reproaches. We have something that is popularly known as the "voice of conscience"; and it is stressed that we should listen to it and follow it, as if it always tells the right thing. This means that there is something inside humans which distinguishes what is right from what is wrong. My dear friends! There is nothing like this inside humans which could discriminate between truth and falsehood. If it were the case then there will be no need for revelation; there will be no need for Prophets and messengers because humans could always decide what is best for them, what is right for them. This happens to be the case with animals. Animals have given this faculty as part of their life. I always give the example of the chicken and the duck eggs. Keep them at the same place and let them hatch. You will find that the chick will run towards land and the duckling to the water. Who has taught them this? Who has taught them the right from the wrong; the truth from the falsehood as far as their life is concerned. No messenger came to them. This sense of discrimination is kept in them by Allah which we call instinct. There is nothing like this in the human child. He becomes a real headache for the mother when he starts crawling: puts his finger in fire if the mother is not careful; eats chilies if they are lying around and starts crying; drowns in water if not monitored. Animal baby will never behave like this. This is only the case with highly developed human child, the best of all creations. And he behaves like this, that he needs to be monitored constantly? He needs guidance from outside. He needs

revelations and messengers to guide him and to tell him what is right from what is wrong; to teach him what truth is and what falsehood is.

There is one thing called relative values that determine good and bad. But there are other values about good and bad which, in reality are good and bad. These are called absolute values. They provide values that are, in fact, good or bad; they are, in reality, *the* truth and *the* falsehood. They are not dependent on circumstances or public approval unlike relative values. If you have to go to your destination and choose the road that is going towards it then you will reach your destination. If you choose the wrong road then you won't reach your destination. The first choice will be right and the second choice will be wrong. These are relative right and relative wrong.

The knowledge of absolute good and absolute evil can only be obtained via revelation

My dear friends! In this open public lectures people of all types participate: intellectual as well as lay persons. I try my best to keep my lectures at a level that everyone can understand. What relative good and relative evil are? – Humans can decide, e.g., choosing the right way to reach the destination. But there are absolute good and absolute evil things. These are permanent and do not depend on any related factors or circumstances. For, example, the right (*Halal*) way to earn a living – this is absolute good and remains permanent, no matter what. Not to exploit others human beings is absolute evil and is permanent and always bad regardless of circumstances and individuals involved. These are absolute values. But, on the other hand, someone is your friend today and you respect him but something happened and he becomes your enemy and your respect for him disappears; then, this respect you had will come under the category of relative value because it was not permanent. The Quran says: Every human being is worthy of respect. This is absolute and a permanent value. It does not matter if someone is your friend or an enemy; if someone is from your tribe or not; or if someone is known to you or not – these are immaterial. This value is absolute and permanent. This is absolute truth. The knowledge of absolute truth and absolute evil is not inside human beings. Human beings receive this knowledge – of absolute truth and absolute evil, i.e., the knowledge of permanent values, through revelation, through Allah's Prophets and Messengers. Since there was no revelation in Hindus – if it had come then it had disappeared – they made their religion based on birth. Some are born Brahmins and some are born Shudras. The child of the Brahmin

is to be respected all his life and child of the Shudra will always be kept under the feet. This is the teaching of Hinduism. But this is false. The truth is: there is no relation to being respected or not based on birth; there is no relative value about it. A child is worthy of respect regardless of where or to whom the child is born. The right of respect is the child's human right. This is a permanent value.

What is the "voice of conscience"?

My dear friends! Let us now come to what is popularly called the "voice of conscience". A Muslim child will eat beef with great pleasure. Keep it in front of an observant Brahmin, he will feel nauseated. What is this? Is it because of the "voice of conscience" of the two? Nobody told them to behave the way like this. Whatever the society inculcated in them: whatever they saw and heard growing up in their respective societies they acquired their respective characteristics. And these characteristics went into their sub-consciousness. Once it got into their subconscious mind this became their "voice of conscience". This is not the way to determine absolute good and absolute evil. The "voice of conscience" is not the final arbiter of things. The "voice of conscience" is nothing but the product of the social environment. It will become what a particular environment makes it. All the idol worshippers justify their practice based on the voice of their conscience. Those making Christ the son of God follow the voice of their conscience. Those opposing this view do it based on the voice their conscience as well.

The "voice of conscience" cannot judge absolute truth and absolute evil

My dear friends! What is called the "voice of conscience" does not have the ability to judge between truth and falsehood. Therefore, the "voice of conscience" is not the standard or the touchstone to judge between good and evil. One's conscience reflects the society one grows in. If something is against it then his conscience will abhor that. This is the basis of نَّفْس اللَّوَّامَةِ. The humans sometimes feel the self-blame.

The working of نَّفْس اللَّوَّامَةِ

I will explain later that even this aspect of self-blame starts disappearing from the human self slowly and gradually when one becomes habituated to doing bad things. For example, the self of professional criminal does not blame him for his crimes. In fact, his self (نَّفْس اللَّوَّامَةِ) gets so blunted that it does not even think that he is doing

something wrong. Only those things he feels blameworthy which have been inculcated in his mind since childhood as being bad. Therefore, what has been inculcated before as being bad only that is reflected by the self نَّفْس اللَّوَّامَةِ. Take for example the child of a tribe whose religion used to be based on cheating, deception, and killing. The children of this tribe were taught this from their childhood that if they did not kill someone they will not get married. I do not know if this tribe still exists. But it does not matter. The whole world is practicing this religion now – just as that earlier tribe. Allama Iqbal (1877-1938) depicts this in one of his poems: Iblis, the great Devil, requested Allah to retire him. Allah asked: Why do you want to be retired? The Devil says: Now everyone is a devil. I am not needed anymore. So, now more or less everyone is accustomed to this religion of cheating, deception, and exploitation – just as it was the religion of that early trickster tribe – and, consequently, their self does not blame them. In fact, it instills in them false-pride that they are smart and intelligent.

The Devil's request to Allah for retirement

The self is the same now as it was when it was taught these things. Then why does it not induce feeling of blame? Well, because the self has this characteristic that it becomes what it is taught. What it *thinks* bad it blames it; what it doesn't, doesn't. But please remember! It is not the case that if it thinks something bad then it is in reality bad. I just mentioned that in this capitalistic system those who exploit the labor of others; those who think it is the right system—they never feel sorry; they never feel pain in their hearts as a result of this exploitation. They suck the blood of the masses but their conscience does not bother them. So, please listen! The human self (or what is popularly called human conscience) cannot distinguish between the absolute truth and absolute falsehood. What it thinks right endorses it and what it thinks evil rejects it, blames it—but only until it remains alive. By being alive is meant that when that crime becomes common then it turns into نَّفْسَ لأَمَّارَةٌ and then it starts provoking it to do crimes as a normal routine. In short, it only remains نَّفْس اللَّوَّامَةِ until it feels bad; until it thinks it has done something bad and feels repentance about it.

The Quranic teaching and "Self"

My dear friends! Let us consider now the teaching of the Quran regarding the *Self*: teach children right from childhood what Allah says in the Quran about right and wrong; create Quranic environment within schools and the larger society. The

bottom line: What the Quran says is right is the absolute right and what it says wrong is absolute wrong. Inculcate in children's heart this message right from the beginning of their consciousness and you see that this becomes the voice of their self (or conscience) when they grow up. These are the people that when any wandering bad thoughts come to them then they immediately turn to the shelter provided by the laws of Allah. Wandering thought because they are taught and trained to recognize absolute truth and absolute falsehood and it could happen that sometimes they may forget; they may err; or simply it could be a slip of mind: وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (28:77). Theirs is not deliberate attempt to circumvent the truth but due to forgetfulness or lack of attention. But as soon as they realize the mistake they take shelter in Allah's laws: فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (16:98). My dear friends! This has become a mere custom now. Otherwise, this was a great thing.

The meaning of تعوذ

The root of تعوذ is ع و ذ. Please note where the Arabs used to use this: Chicks remain close to their mother hen while feeding. When they see any danger (even an eagle flying overhead) the chicks immediately run for cover under the protective wings of the mother hen. This process of running to seek shelter under a cover is called عوذ. Now you can understand the real meaning of فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (16:98). I am taking shelter under the wings of the laws of Allah because of the danger posed by the devil. The word taaweez (تعویذ) that we are so familiar with is from this root.

The Taaweez (تعویذ) of the Sheikh

My dear friends! Now that you asked for protection from danger then the Sheikh made it very easy. Get the Taaweez (تعویذ) from him; hang it in your neck; protection granted; everything is taken care of! No matter the laws of Allah. No matter the real meaning of عوذ; nor that of فاستعذ با ؔ; nor even the devil.

The word Taaweez (تعویذ) is also from the root ع و ذ. Consider now the root meaning given above and then compare it with what is customary practice of wearing the traditional Taaweez (تعویذ). The Sheikh says: Where are you running to? Come to me. I will tell you how to get protection. Take the Taaweez (تعویذ) from me; not one but three. Put one in your neck; one around the arm; and hang one on the front door of your house – this way you will get protection round the clock. Your house will become God's fortress: فاستعذ با ؔ written down inside the Sheikh's Taaweez (تعویذ).

How beautifully it is put in the following couplet:

Wandering, where have you come by, O madman?

The place of benefit and loss has come, O madman!

To come under the wings of the law of Allah

My dear friends! I am talking about نَّفْس اللَّوَّامَةِ. Implement the Quran's curriculum; and teach, train, and create the right environment and the society for the new generation: by programming their unconscious mind with its truth and falsehood; with its good and evil; and with what it allows and what it forbids. Then a child educated and trained under this environment will never do a bad thing deliberately. *This* will become the voice of his conscience. If, sometimes, a mistake or slip of mind happens then his نَّفْس اللَّوَّامَةِ immediately warns him about it and he rushes under the protective wings of the law of Allah; he turns to His shelter: and retraces his wrong steps and returns to the right place. This is called **التوبـة**. This was the result of نَّفْس اللَّوَّامَةِ which stopped him because his unconsciousness was programmed with the Quranic values of right and wrong. These values became embedded in his subconscious mind. Nobody decided this for him. If the parents were to decide this, then this will never work. Parents of different religions (including Muslims) teach their own values to their children but that is not the same thing.

My dear friends! Absolute good and absolute evil are those that have been given by Allah in the Quran. These are the values that need to be taught and inculcated into the hearts of children. This is not a matter of teaching only. This is something like the breath we take. The whole society should be flooded with the Quranic values and thoughts so that it gets into the very sub-consciousness of individuals thus molding their character on Quranic pattern. Otherwise, individuals will get easily wrought by different satanic forces, like the familiar excuse of everybody does it. But while the elders repeat that "everybody does routine" the children's sub-consciousness is being programmed by subliminal messages that it is ok to cheat; it is ok to lie; it is ok to trick; it is ok to exploit etc… These children when they grow up their نَّفْس اللَّوَّامَةِ will never feel any blame, will never reproach. In fact, for them, it would be business as usual.

There is no such thing in reality as the "voice of conscience"

My dear friends! I think you have now understood the reality behind نَفْس اللَّوَّامَةِ. This is an extremely important point. We believe in something in our culture called the "voice of conscience" which we assume tells us the right thing. But there is no such thing in our conscience. The conscience is made by the society; by the education and training; by the parents. It is mostly made by the environment and the actions around it than sermons and speeches. Now you see how important this نَفْس اللَّوَّامَةِ is. It cannot prevent humans from doing evil where there is this wrong concept of "voice of the conscience". In fact, it turns into نَفْسَ لأَمَّارَةٌ.

If the conscience is reared and trained on a foundation provided by Quranic education and conception then only that conscience will stop someone if, inadvertently, he takes a wrong step. A Momin never deliberately takes a wrong turn. If by mistake he takes a wrong turn then right away his نَفْس اللَّوَّامَةِ stops him; and then he returns to the place he took the wrong turn. This is **التوبـة**. So far this is only a negative step. Whatever wrong was done has been undone; and then comes the positive step of moving towards the proper destination. This is called عمل صالح (righteous deed). In the Quran both **التوبـة** and عمل صالح have come together. The conscience trained this way has brought him to this point. Now the Quran's education and its realities are in front of him. They tell him how to proceed properly. The path thus taken will be the right one according to the Quran. This is the proper way to judge the right and wrong; this is the way to judge between truth and falsehood; this is the process to determine between good and evil, between what is allowed and what is forbidden. No one has the right to choose one and reject the other. This is the reason the Quran has presented نَفْس اللَّوَّامَةِ as a witness. This is a great thing. Let me remind once again that if we have educated and trained the self on the wrong pattern then this is also the worst thing. Human becomes satisfied with his "voice of conscience" although it is the voice of falsehood. This is the reason the Quran says: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ (75:3). Their denial was based on their past practice.

A wish is also a sign

My dear friends! I have been stressing all along that the foundation of *Deen* is based on the law of requital. Human's every action; his every intention; his every wish; his every desire – even if unfinished or half-baked – produces its result. Wrong action or wrong intention *will* produce wrong result, and good action or good intention will

produce good result. Whatever Allah has said to be good *is* good and whatever He has said as bad *is* in fact bad. Every action produces result and it starts appearing in this life itself. The difference between this life and that life is our creation. Life is one continuous whole; life is a continuous flowing stream and desires continuity. Don't ever think of it as just spoken words. Before they were outside the wall; now, after death, they are inside. We see the wall (of death) and think that life ended. But it is not so. Humans have to face the results of their actions – and as I mentioned even the intention are included in this: Good actions produce good results and bad actions produce bad results. Life goes forward. The Quran goes so far as to say that our selves carry the heaven or hell within them right from here. The Quran says that heaven or hell remains hidden here and gets exposed there. That is, the result remains hidden here and it gets exposed there. The same thing the Quran says in another way thus: The hell is looking at you even now; it is only that you cannot see it. This is the real thing. The Quran has explained this in many ways. Those who denied said: No way! It is not going to happen. Those who died are finished; their bones decayed; their body, their flesh, their hair – all disappeared. Nothing remained of them. The Quran says to them that Allah who created them from nothing in the first place has all the power to create them again. This is a very beautiful proof and reasoning. Completely irrefutable!

Nothing can be said about *Nothingness*

My dear friends! Human knowledge, no matter how advanced it becomes, will never be able to tell what is nothingness. Human mind cannot comprehend how something can be created from nothing. Once something has been created and comes into existence, only then human mind is capable of understanding and exploring and creating new things from existing things. How beautifully Ghalib puts it:

Even if you were to harbor enmity; I would take it as affection

But when there is nothing then how can I expect any deception?

There is no way for human mind to imagine nothingness. All the great scientists are left in awe about it. They are able to understand and link the chain of cause and effect until they reach cul-the-sac where there is effect but no cause. Water is made of hydrogen and oxygen but wherefrom these elements came in the first place? This is where a scientist and a shepherd both stand at the same place. Neither the shepherd

nor the scientist can tell anything about it.

The Quran has challenged all the top scientists of the world to come up with an explanation of how something can come into being from nothing. Obviously, human mind, no matter how great, is incapable of finding an answer to this question based on human knowledge. It can only say, as many top scientists say, that it happens by chance. On the other side of the coin is the question: what happens to human body when it dies. Scientists can only tell that it decays; that insects eat it; that it is consumed and becomes part of the earth. But at least something remains of it. Whereas, you are standing at a place where you say "there was nothing and something came into being"? So, the Almighty who created something from nothing, can't He recreate human beings; at least there remains something of them after they have died?

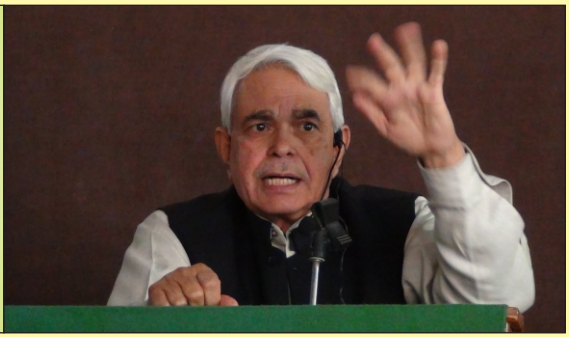
My dear friends! Look at the reasoning of the Quran! It is so powerful and awesome. It says that by mixing existing things in different ways and creating new things out of them is what you do. But in the world of (what the Quran calls) Amr (امر) where there is no access of humans and has nothing, the Almighty Allah using His امر creates new things; so, can't He recreate human beings? The root of عِظَامَ is: ع ظ م and its meaning is: a hard stones on which a building stands. The Arabs used to put a hard wood embedded with iron ploughshare under the plough which they called عظم. (This is different from عزم which is with letter ز.) The Quran says that the thing which forms the foundation of human life – as opposed to physical life which you see and which vanishes after death – and which Allah had created from nothingness (عدم) remains with Him. So, He can create the structure again on that same foundation. This is the reasoning that the Quran has given about life after death.

Dear friends! We could cover only three verses of Surah *Al-Qiyamah* (القيامة). I think we learnt some useful things today. We will take up from verse 4 in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

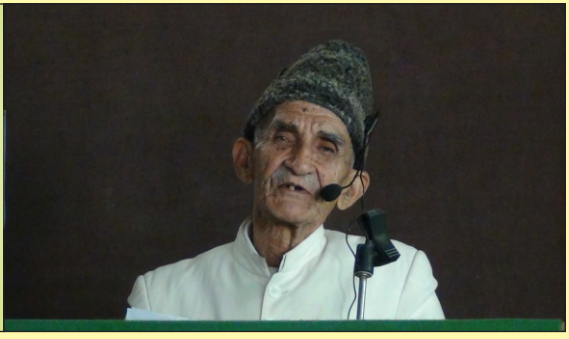
☆.....☆.....☆



تقریب بیادِ پرویز
23 فروری 2014ء کے موقع
پر شیخ اللہ دتہ صاحب
خطاب فرماتے ہوئے



محمد اکرم راٹھور صاحب کے لحن میں کلامِ
اقبال سنتے ہوئے حاضرین محفل کی
محویت کا ایک منظر
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے



حنیف وجدانی صاحب
(مری) اپنے خیالات
کا اظہار فرماتے ہوئے۔



کشمالہ پرویز
اپنے منفرد انداز میں
پرجوش تقریر کرتے ہوئے

(بقیہ صفحہ 66 پر)



محمد عمر صاحب
انچارج بزم لاہور
اسٹیج سیکرٹری کے فرائض
سرانجام دیتے ہوئے



ڈاکٹر سید فریدالدین احمد صاحب
اظہارِ خیال
کرتے ہوئے



عبدالعزیز خالد کی نظم
''بیادِ پرویز'' تحت اللفظ
پڑھی جارہی ہے



شکیل احمد مغل صاحب
اپنے تاثرات بیان
کرتے ہوئے